بسم اللہ الرحمن الرحیم

وحدت امت کا داعی اور غلبہ اسلام کا علم بردار

ماہنامہ الشریعہ گوجرانوالہ

جلد ۲۳ o شمارہ نمبر ۶ o جون ۲۰۱۲ء

بیاد: حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ / حضرت مولانا صوفی عبد الحمید سواتیؒ

—— رئیس التحریر ——

ابو عمار زاہد الراشدی

—— مدیر ——

محمد عمار خان ناصر

—— مجلس تحریر ——

پروفیسر غلام رسول عدیم

پروفیسر میاں انعام الرحمٰن

پروفیسر محمد اکرم ورک

مولانا حافظ محمد یوسف

چودھری محمد یوسف ایڈووکیٹ

حکیم محمد عمران مغل

شبیر احمد خان میواتی

—— انتظامیہ ——

ناصر الدین عامر / عبد الرزاق

حافظ محمد سلیمان / حافظ محمد طاہر

o

کلمہ حق

امریکی اسکول کے نصاب میں اسلام کی کردارکشی — رئیس التحریر — ۲

آرا و افکار

''میری علمی ومطالعاتی زندگی'' [ڈاکٹر صفدر محمود سے انٹرویو] — ۵

خاطرات — محمد عمار خان ناصر — ۱۴

مباحثہ ومکالمہ

ہندوستان کی روایتی اسلامی فکر میں تاریخ اور قانونی معیاریت (قاری محمد طیبؒ کے افکار کا مطالعہ ـ ۲) — ڈاکٹر ابراہیم موسیٰ — ۱۹

سرسید احمد خان کی سیاسی فکر کے نتائج واثرات — کے ایم اعظم — ۳۱

اخبار وآثار

ائمہ وخطبا کی مشکلات، مسائل اور ذمہ داریاں (الشریعہ اکادمی میں سیمینار) — ۴۲

تعارف وتبصرہ

ماہنامہ الشریعہ کی خصوصی اشاعت / جرح وتعدیل / تحقیقات حدیث — ۵۴

امراض وعلاج

نفسیاتی علاج کی اہمیت — حکیم محمد عمران مغل — ۵۶

o

شعبہ ترسیل	زیر اہتمام	خط وکتابت کے لیے	زر تعاون
حافظ محمد طاہر	الشریعہ اکادمی	ماہنامہ الشریعہ	سالانہ 250 روپے
جامع مسجد شیرانوالہ باغ گوجرانوالہ	ہاشمی کالونی کنگنی والا گوجرانوالہ	پوسٹ بکس 331 گوجرانوالہ	بیرون ملک سے
0306-6426001		aknasir2003@yahoo.com	25 امریکی ڈالر

ناشر: حافظ محمد عبد المتین خان زاہد ـ طابع: مسعود اختر پرنٹرز، میکلوڈ روڈ، لاہور

''اپنی بات اپنے انداز میں کہنے اور اسے دنیا کے ہر کونے میں پہنچانے کی جو سہولتیں آج میسر ہیں، اس سے پہلے کبھی وہ ہماری دسترس میں نہیں تھیں، اس لیے مغرب کی علمی وفکری دھاندلی کے خلاف احتجاج اور غم وغصہ کے اظہار کے ساتھ ساتھ ہمارے علمی اداروں کو اس طرف بھی توجہ دینی چاہیے۔'' [کلمہ حق]

امریکی فوجی اسکول کے نصاب میں اسلام کی کردار کشی

امریکی فوج کے اسکولوں میں اسلام کے بارے میں پڑھائے جانے والے ایک نصاب پر ان دنوں بحث جاری ہے۔ اخباری رپورٹوں کے مطابق خود امریکی فوج کے سربراہ جنرل مارٹن ڈیمپسی نے اس نصاب کو قابل اعتراض قرار دیا ہے جبکہ پینٹاگون نے تصدیق کی ہے کہ مذکورہ کورس کے بارے میں ان کی ویب سائٹ پر موجودہ نصاب اصلی ہے۔ ایک برطانوی نشریاتی ادارے کی رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ کسی امریکی فوجی کی شکایت سامنے آنے پر جنرل مارٹن نے اس کورس کا نوٹس لیا ہے اور اسے قابل اعتراض اور دوسرے مذاہب کے احترام کے بارے میں امریکی اقدار کے منافی قرار دے کر اس کی انکوائری کا حکم دیا ہے۔ مذکورہ کورس کے حوالے سے ان رپورٹوں میں بتایا گیا ہے کہ اس کورس کے ذریعے امریکی فوجیوں سے کہا جاتا ہے کہ اسلام میں اعتدال پسندی نام کی کوئی چیز نہیں ہے اور وہ ان کے مذہب کو اپنا دشمن تصور کریں۔ کورس میں یہ بھی درج ہے کہ امریکہ دنیا کے تمام مسلمانوں کے ساتھ جنگ کی حالت میں ہے اور یہ ممکن ہے کہ امریکہ مسلمانوں کے مقدس مقامات مکہ اور مدینہ کو (نعوذ باللہ) جوہری ہتھیاروں کے ذریعے تباہ کر دے۔

جنرل مارٹن ڈیمپسی کی طرف سے انکوائری کا کیا نتیجہ سامنے آتا ہے، اس کے بارے میں ہم کچھ کہنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے، اس لیے کہ اس میں مسلمانوں کے غم وغصہ اور جذبات کو کم کرنے کی حکمت عملی کے تحت یقیناً لیپا پوتی سے کام لیا جائے گا اور وہی کچھ ہوگا جو اس قسم کی رپورٹوں میں عام طور پر ہوا کرتا ہے۔ البتہ اس کورس کے بارے میں کچھ گزارشات پیش کرنے کی ضرورت بہرحال محسوس ہو رہی ہے۔

ہمیں اس کورس اور اس کے امریکی فوج کے اسکولوں میں پڑھائے جانے کے اس انکشاف پر کوئی تعجب نہیں ہوا، اس لیے کہ یہ نہ تو پہلی بار ہو رہا ہے اور نہ ہی امریکی جنرل کی طرف سے انکوائری کے آرڈر پر یہ سلسلہ رک جائے گا۔ یہ تو مغرب کی صدیوں سے چلی آنے والی پالیسی ہے جس کے سیکڑوں مظاہر و مشاہدات تاریخ کے اوراق میں محفوظ ہیں اور مغرب کی تعلیم گاہوں میں پورے اہتمام کے ساتھ اس بات کی کوشش ہوتی آ رہی ہے کہ دنیا کے سامنے، خاص طور پر مغربی دنیا کے سامنے اسلام اور مسلمانوں کی ایسی تصویر پیش کی جائے جو نفرت اور کراہت کا باعث بنے اور اسے دیکھنے والوں کے ذہن اسلام کے بارے میں کوئی مثبت رائے قائم کرنے کی پوزیشن میں نہ رہیں۔

چند سال قبل جب سربیا اور بوسنیا کا تنازع عالمی سطح پر زیر بحث تھا، ان دنوں کی بات ہے کہ برطانیہ کے شہر لیسٹر میں محترم پروفیسر خورشید احمد کے ادارے ''اسلامک فاؤنڈیشن'' نے اس سلسلے میں ایک سیمینار منعقد کیا جس میں

برطانوی پارلیمنٹ کے ممبر جم مارشل نے بھی شرکت کی۔ میں ان دنوں وہیں تھا اور اس سیمینار میں شریک ہوا تھا۔ جم مارشل نے اس موقع پر بہت فکر انگیز گفتگو کی جس میں انھوں نے کہا کہ اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں مغربی دنیا کے ذہنوں میں جو کنفیوژن پایا جاتا ہے، اس کی طرف توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ انھوں نے کہا کہ کنفیوژن یہ ہے کہ ہمارے ذہنوں میں اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں ایک تصویر وہ ہے جو ان معلومات سے قائم ہوتی ہے جو ہمارے بڑے نسل در نسل ہمیں روایتی انداز میں فراہم کرتے آ رہے ہیں اور یہ بڑی خوف ناک تصویر ہے۔ دوسری تصویر وہ ہے جو تاریخ کے مطالعہ اور مستند مواد تک رسائی سے ہمارے ذہنوں میں تشکیل پاتی ہے۔ یہ پہلی تصویر سے یکسر مختلف ہے، مگر آج کے ان مسلمانوں کو دیکھ کر جو ہمارے ساتھ رہتے ہیں، جو تصویر ذہنوں میں بنتی ہے، وہ ان دونوں تصویروں سے مختلف ہے۔ جم مارشل نے اس کنفیوژن کا ذکر کرتے ہوئے مسلمان دانش وروں سے کہا کہ وہ اس کنفیوژن کو دور کرنے کی کوشش کریں اور یہ کہ اگر اس کنفیوژن کو دور کیا جا سکے تو مغربی دنیا اسلام کی بات سننے کے لیے آج بھی تیار ہے۔

جم مارشل کی اس تقریر کا حوالہ ہم نے اس لیے دیا کہ مغربی خاندانوں میں اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں جو تاثرات اور احساسات نسل در نسل چلے آ رہے ہیں، وہ تاریخ کے مطالعہ اور موجودہ مسلمانوں کو دیکھ کر قائم ہونے والے احساسات اور تاثرات سے بالکل مختلف ہیں اور یہی تاثرات امریکی فوج کے اسکولوں میں پڑھائے جانے والے اس کورس کی بنیاد ہیں، اس لیے ہمیں اس پر افسوس ضرور ہے، مگر تعجب بالکل نہیں ہے، اس لیے کہ ایسا صدیوں سے ہو رہا ہے اور آج بھی مذہب سے لاتعلقی کے ٹائٹل اور سیکولرزم کے عنوان کے باوجود مغربی حکمرانوں کی مجبوری ہے کہ وہ اسلام اور مسلمانوں کی کوئی ایسی تصویر دنیا کے سامنے نہ آنے دیں جو اسلام کے بارے میں مثبت سوچ پیدا ہونے کا ذریعہ بن سکے۔

کچھ عرصہ قبل جب پاکستان کے دینی مدارس کے خلاف مغربی دنیا کی پروپیگنڈا مہم عروج پر تھی، ان دنوں ایک دستاویزی فلم کا بہت شہرہ ہوا جو مختلف مغربی ممالک کے مقتدر حلقوں کو بطور خاص اہتمام کے ساتھ دکھائی گئی۔ میں نے بھی وہ فلم ان دنوں دیکھی تھی۔ اس میں پاکستان کے کسی بھی مکتب فکر کے کسی معیاری دینی مدرسے کا تذکرہ موجود نہیں تھا جو کم وبیش ملک کے ہر بڑے شہر میں پائے جاتے ہیں، بلکہ کسی دور دراز دیہات کے ایک مدرسے کو فوکس کیا گیا تھا جو کچھ بعید نہیں کہ اس مقصد کے لیے خاص طور پر تیار کیا گیا ہو اور دینی مدرسے کے اندرونی ماحول کو انتہائی مکروہ انداز میں پیش کر کے نفرت پھیلانے کی کوشش کی گئی تھی۔ مجھے یہ ''دستاویزی فلم'' دیکھنے کا موقع لندن میں ملا تھا اور فلم دکھانے کے بعد مجھ سے میرے تاثرات کے بارے میں پوچھا گیا تو میں نے عرض کیا تھا کہ میں بیسیوں نہیں بلکہ سیکڑوں ایسے مدارس کی نشان دہی کر سکتا ہوں جن میں سے ایک کو بھی اس دستاویزی فلم کا حصہ بنا لیا جائے تو وہ سارا تاثر خاک میں مل جاتا ہے جو اس فلم کی تیاری اور تشہیر کا مقصد دکھائی دیتا ہے۔

امریکی فوج کے اسکولوں میں مبینہ طور پر پڑھائے جانے والے اس کورس پر مختلف حلقوں کی طرف سے جو احتجاج جاری ہے، وہ ملی حمیت کا تقاضا ہے اور ہر مسلمان کو اپنے اپنے انداز میں اس احتجاج میں ضرور شریک ہونا چاہیے، لیکن اس سے کہیں زیادہ ضرورت اس امر کی ہے کہ آج کے ابلاغ کے وسیع تر ذرائع سے بھرپور استفادہ کرتے ہوئے اسلام کی تعلیمات اور آج کے حالات میں قرآن وسنت اور خلافت راشدہ کے احکام وقوانین کی تطبیق کی قابل عمل صورتوں کو

اجاگر کیا جائے۔ اپنی بات اپنے انداز میں کہنے اور اسے دنیا کے ہر کونے میں پہنچانے کی جو سہولتیں آج میسر ہیں، اس سے پہلے کبھی وہ ہماری دسترس میں نہیں تھیں، اس لیے مغرب کی علمی وفکری دھاندلی کے خلاف احتجاج اور غم وغصہ کے اظہار کے ساتھ ساتھ ہمارے علمی اداروں کو اس طرف بھی توجہ دینی چاہیے۔ آج کے عالمی حالات کے تناظر میں اور مستقبل کی فکری وعلمی ضروریات کے پیش نظر سب سے زیادہ ضرورت اس امر کی ہے۔

مولانا محمد اسلم شیخوپوری کی شہادت

گزشتہ ماہ کے دوران میں ملک کے تین معروف علما، مولانا نصیب خان، مولانا سید محمد محسن شاہ اور مولانا محمد اسلم شیخوپوری کو مختلف واقعات میں شہید کر دیا گیا۔ یہ سب حضرات ہمارے محترم تھے اور سب کی شہادت اور جدائی پر ہم غم زدہ ہیں، لیکن مولانا محمد اسلم شیخوپوری کی شہادت پر ہمارا صدمہ دوہرا ہے، اس لیے کہ وہ ہمارے ساتھی تھے اور انھوں نے طالب علمی کا ایک دور ہمارے درمیان گزارا ہے۔

مولانا محمد اسلم شیخوپوری نے دینی تعلیم کا آغاز باغبانپورہ لاہور میں ہمارے مخدوم حضرت مولانا محمد اسحاق قادری قدس اللہ سرہ العزیز کے ہاں کیا تھا جو شیخ التفسیر حضرت مولانا احمد علی لاہوری کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔ مولانا شیخوپوری نے صرف ونحو کی ابتدائی تعلیم ان سے حاصل کی اور ان کے بچوں کے ساتھ کچھ عرصہ ان کے گھر میں رہے۔ حضرت مولانا محمد اسحاق قادری کی اہلیہ محترمہ ان سے اپنے بچوں کی طرح پیار کرتی تھیں اور وہ بھی ان سے بہت مانوس تھے۔ مولانا محمد اسلم شیخوپوری نے درس نظامی کی تکمیل جامعہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ میں کی اور وہیں دورۂ حدیث کر کے فراغت حاصل کی۔ بعد میں وہ کراچی تشریف لے گئے اور غالباً جامعہ بنوری ٹاؤن کے دورۂ حدیث میں بھی شریک ہوئے۔ قرآن کریم کے درس کا ذوق انھوں نے اپنے دو بزرگ اساتذہ حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر اور حضرت مولانا صوفی عبد الحمید سواتی سے پایا اور وہ اس کا مختلف مواقع پر تذکرہ بھی کرتے تھے۔

مولانا محمد اسلم شیخوپوری شہید آج کے دور میں شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندی کی اس تعلیمی وفکری جدوجہد کا اہم کردار تھے جو حضرت شیخ الہند نے مالٹا کی قید سے رہائی کے بعد ہندوستان واپس پہنچنے پر شروع کی تھی کہ مسلمانوں میں اجتماعیت کے فروغ کی محنت کی جائے اور قرآنی تعلیمات عام مسلمانوں تک پہنچانے کی جدوجہد کی جائے۔ مولانا شیخوپوری نے قرآن کریم کے درس کے لیے جو اسلوب اختیار کیا، وہ آج کے نوجوان علماء کرام کے لیے مشعل راہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

مولانا انیس الرحمٰن درخواستی سے لے کر مولانا محمد اسلم شیخوپوری کی شہادت تک ہمارے جتنے بزرگ اور ساتھی شہید ہوئے ہیں، ان سب میں مشترک بات یہ تھی کہ وہ دین کے لیے ہمہ وقت متحرک تھے اور ان کے گرد علماء کرام کے ساتھ ساتھ عوام بھی جمع ہو رہے تھے۔ ان حضرات کی شہادت سے ہم غم زدہ ضرور ہیں، مگر مایوس قطعاً نہیں ہیں اور نہ ہی شہادتوں کا یہ سلسلہ ہمارے حوصلوں کو ناکام بنا سکتا ہے۔ یہ ہمارے بزرگوں کی جدوجہد ہے جو اپنی روایات کے مطابق آگے بڑھتی رہے گی۔ اللہ تعالیٰ تمام شہدا کو جنت الفردوس میں جگہ دے اور ہم سب کو ان کا مشن جاری رکھنے کی توفیق سے نوازے۔ آمین یارب العالمین

انٹرویو: عرفان احمد

''میری علمی ومطالعاتی زندگی''

[ڈاکٹر صفدر محمود سے انٹرویو]

گجرات کے ایک چھوٹے سے قصبے ڈنگہ سے میرا تعلق ہے، جو کھاریاں رسول روڈ پر صدیوں سے واقع ہے، سندر داس ایک بہت بڑا بزنس مین تھا اُس نے ڈنگہ میں بہت ہی شاندار بلڈنگ ہائی سکول کے لیے بنوائی تھی، اب یہ ہائر سیکنڈری سکول ہے آٹھویں تک میری تعلیم وہاں ہوئی جس تعمیر ملت سکول رحیم یار خان سے میں نے میٹرک کیا وہ سکول بنیادی طور پر جماعت اسلامی کے اراکین کی زیر نگرانی چلتا تھا، اس سکول میں فکری نشو ونما اور کردار سازی پر بڑی توجہ دی جاتی تھی۔ امتحان سے زیادہ کردار سازی پر توجہ ہوتی تھی فکری نشو ونما پر زیادہ زور تھا اُس کے بعد گورنمنٹ کالج لاہور سے بی اے اور بی اے آنرز کیا اور پھر ایم اے کیا اور پھر گورنمنٹ کالج لاہور میں ہی لیکچرار کی حیثیت سے تقرر ہوا جہاں سے میں نے (1967) میں CSS کا امتحان پاس کیا اور سول سروس میں چلا گیا۔

میں بچپن ہی سے Creative تھا ایک ایسا لڑکا جو تصورات اور تخیل کی دنیا میں رہتا ہو مجھے یاد ہے جب میں بہت چھوٹا بھی تھا تو عام طور پر تخیل میں گم سا رہتا تھا جہاں تک مجھے یاد ہے میں چھٹی کلاس میں تھا میرے پاس کوئٹہ سے ایک ماہانہ رسالہ ''زمانہ'' آیا کرتا تھا مجھے جہاں تک یاد پڑتا ہے میری پہلی کہانی اس رسالے میں چھپی تھی پھر جب میں نویں، دسویں میں تھا اور میں رحیم یار خان میں پڑھتا تھا تو لاہور سے نکلنے والے رسالہ ''بچوں کی دنیا'' میں میری چھوٹی موٹی کہانیاں کبھی کبھار چھپتی تھیں جس کی تصیح میرے استاد انیس احمد اعظمی صاحب کیا کرتے تھے میں اپنے اُستاد کو اپنی ہر تحریر دکھاتا تھا۔ انیس صاحب میری حوصلہ افزائی کرتے اور اس کو ٹھیک کر دیتے تھے اُس کے بعد گورنمنٹ کالج کے زمانے میں بھی مسلسل لکھتا رہا۔ ہمارے زمانے میں گورنمنٹ کالج کے میگزین راوی کا شمار اچھے پرچوں میں ہوتا تھا اور راوی سال میں تین دفعہ چھپا کرتا تھا اس طرح آپ اسے ایک طرح کا سہ ماہی رسالہ بھی کہہ سکتے ہیں جتنا عرصہ میں گورنمنٹ کالج میں رہا شاید ہی کوئی ایسا راوی ہو جس میں میرا کوئی مضمون یا افسانہ نہ چھپا ہو۔ انہی دنوں میں نے اخبارات اور رسائل میں تقریریں لکھنا شروع کیا، روزنامہ مشرق، نوائے وقت ہفت روزہ قندیل اور اقدام میں بھی عام طور پر لکھا کرتا تھا اور نیم ادبی رسالوں کے علاوہ پنجاب یونیورسٹی کے میگزین میں بھی میرے افسانے چھپتے رہتے تھے اسی دور میں

میری ایک کہانی خوشتر گرامی کے رسالے بیسویں صدی میں چھپی جس کا ادبی حلقوں میں خاصا ذکر رہا۔ بیسویں صدی معیاری اور مقبول رسالہ تھا چنانچہ مجھے بہت سے خطوط موصول ہوئے۔ گورنمنٹ کالج لاہور میں ہر سال کا نوکیشن کے موقع پر بہترین لکھاری کا ایوارڈ دیا جاتا ہے میں بی اے آنرز کا طالب علم تھا جب 1963 میں مجھے بہترین لکھاری (اردو) اور طارق علی خان کو بہتری لکھاری (انگریزی) کے ایوارڈ ملے۔ بہترین لکھاری کا ایوارڈ کالج کا بہت بڑا اعزاز سمجھا جاتا تھا۔ گورنمنٹ کالج لاہور میں طالب علم تھا تو میں نے نیو ہوسٹل سے ایک رسالے کا آغاز کیا جس کا نام ''پطرس'' ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ وہ رسالہ ابھی تک شائع ہو رہا ہے اور اس میں میرا نام پہلے ایڈیٹر کی حیثیت سے شامل ہوتا ہے۔ گویا گورنمنٹ کالج لاہور کے دور میں ہی میں لکھنے پڑھنے میں خاصا مصروف ہو گیا۔ ریڈیو کے پروگراموں میں شرکت کرنے، یونی ورسٹی اور کالج میگزین اور اخبارات کی وجہ سے لاہور کے اخباری حلقوں میں میرا نام طالب علمی کے زمانے میں ہی مانوس ہو گیا تھا۔

دراصل کچھ لکھنے پڑھنے کی صلاحیت قدرت کی طرف سے ودیعت ہوتی ہے اور اگر اچھا ماحول اور مناسب اساتذہ مل جائیں تو وہ اس صلاحیت کی نشوونما کر کے پروان چڑھا دیتے ہیں اور آپ کی تربیت کر کے آپ کی تخلیقی صلاحیتوں کو مزید اجاگر کر دیتے ہیں۔ میرے کردار پہ کسی حد تک اثر میرے رحیم یار خاں کے سکول کے ایک استاد کا ہے جن کا نام انیس احمد اعظمی ہے یہ اعظم گڑھ (یوپی) کے رہنے والے تھے۔ جماعت اسلامی سے متاثر تھے اور جماعت پر تنقید بھی کرتے تھے میرے زمانے میں وہ تعمیر ملت سکول رحیم یار خان میں میرے استاد تھے وہ مجھے کتابیں دیا کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ پڑھ کے مجھے بتاؤ کہ تم نے کیا پڑھا ہے، اس طرح بچپن سے ہی انہوں نے میرے اندر تاریخ کا شوق پیدا کیا اور پھر یہ شوق زندگی بھر کے لیے میرا یہ ذوق بن گیا اور میرے مزاج کا حصہ بن گیا اُن کے نام سے میں نے ایک اپنی کتاب بھی منسوب کی ہے جس کا نام ہے ''پاکستان تاریخ و سیاست'' اُس کے بعد جب میں گورنمنٹ کالج لاہور پہنچا تو پروفیسر مرزا محمد منور صاحب نے مجھ پر خاصی توجہ دی۔ اقبالیات اور تحریک پاکستان کے بارے میں میرے اندر ذوق وشوق پیدا کیا اور پھر زندگی کے آخری دنوں تک میرا اُن سے قلبی و ذہنی تعلق رہا جو میری زندگی کا بیش بہا اثاثہ ہے ان کے ساتھ گزارے ہوئے وقت کو میں زندگی کے قیمتی لمحات سمجھتا ہوں۔ مرزا محمد منور بہت پڑھے لکھے اور درویش صفت کے انسان تھے عالم فاضل، عاشق رسولؐ، عاشق اقبال، عاشق قائداعظم تحریک پاکستان سے گہری وابستگی رکھتے تھے۔ اُنہوں نے مجھ پر توجہ بھی دی اور خاص طور پر قائداعظم، اور تحریک پاکستان سے محبت کا ایک رشتہ قائم کر دیا۔ محبت اور شوق کا یہ رشتہ قائم کرنے میں اُن کا بنیادی کردار تھا۔ سکول اور کالج کی سطح پر جن استادوں نے مجھ پر توجہ دی میں اُن کا احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گا بعد ازاں ان اساتذہ سے میرا تعلق دوستی کے رشتے میں ڈھل گیا۔ دوستی کا یہ رشتہ آج تک قائم ہے۔

طالب علمی کے زمانے میں ایک Rolling Stone کی مانند تھا لیکن آج واپس مڑ کر دیکھتا ہوں تو محسوس ہوتا ہے کہ بعض اوقات کچھ لوگ ہوتے ہیں جو کسی شعبہ یا مضمون سے وابستہ ہو جاتے ہیں اور یہ صرف اسی کا مطالعہ کرتے ہیں۔ کم از کم ایم اے تک میری یہ کیفیت نہیں تھی جو بھی کتاب ملی وہ پڑھ لی مثلاً میرے اُستاد جن کا میں نے ابھی ذکر

کیا انیس احمد اعظمی صاحب انہوں نے مجھے 9th اور 10th میں جو کتابیں دیں اُن میں سب سے پہلی کتاب مولانا ابوالکلام کی غبار خاطر تھی اور مجھے آج تک یاد ہے کہ وہ کتاب میں نے ایک رات میں پڑھ ڈالی تھی شام کو بستر پہ لیٹ کر شروع کی اور ختم کر کے اٹھا، اور اگلے دن اُن کو جا کر واپس کر دی اس کتاب میں سے پڑھے ہوئے اشعار مجھے اب بھی یاد ہیں۔ پھر میں نے افسانے بے پناہ پڑھے نقوش کے کئی افسانہ نمبر آئے جنہیں میں شوق سے پڑھتا رہا۔ راجندر سنگھ بیدی سے لے کر منٹو، کرشن چندر، قرۃ العین، ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور، احمد ندیم قاسمی، اشفاق احمد، بانو قدسیہ، ممتاز مفتی، شہاب سبھی کو اس دور میں پڑھا۔ بعد ازاں منشا یاد کے افسانوں سے متاثر ہوا اور صادق حسین، انتظار حسین کو شوق سے پڑھا۔ جدید شعراء میں فیض سے اسرار الحق مجاز، ساحر لدھیانوی، احمد ندیم قاسمی تک میں نے تقریباً سبھی شعرا کو پڑھا اور اُس زمانے تک جتنے دیوان فیض صاحب کے چھپ چکے تھے۔ تقریباً تین چار مجھے زبانی یاد تھے۔ کلام اقبال کا مجھے بے حد شوق تھا، میں ہوسٹل میں کمرہ بند کر کے کلام اقبال کو اونچی آواز سے اور ذوق وشوق سے پڑھا کرتا تھا مطلب یہ کہ مطالعے کی حد تک شاعری بھی ساتھ ساتھ چلتی رہی۔ ایم اے کرنے کے بعد جا کر مجھ پر وہ اسٹیج آئی کہ میں نے تحریک پاکستان اور تاریخ پاکستان کو اپنا اوڑھنا، بچھونا بنا لیا۔ Rolling stone ہونے کی وجہ سے مجھے ایک فائدہ یہ ہوا کہ اگرچہ میں ساری زندگی باقاعدہ اردو ادب کا طالب علم نہیں رہا لیکن مجھے اردو لٹریچر سے تھوڑی سی شناسائی حاصل ہوگئی۔ اقبالیات کو بھی پڑھا دنیا جہان کی جو چیزیں مجھے ملتی گئیں میں پڑھتا گیا۔ جب میری اپنی اولاد جوان ہوئی اور میں یونیورسٹی اور کالجوں میں جاتا رہا قائداعظم یونی ورسٹی میں وزٹنگ پروفیسر رہا اور پھر ایک یونیورسٹی کا وائس چانسلر بھی رہا اس طرح میرا طالب علموں سے گہرا رابطہ رہا تو پتا چلا کہ آج کے طلبہ اپنے Subject کے علاوہ دنیا کی کوئی اور بات جانتے ہی نہیں تب مجھے محسوس ہوا ہمارے استادوں کی پالیسی ٹھیک تھی کہ ان کی بنیاد وسیع کرو۔ مثلاً میں نے قرآن حکیم کی تفسیر پڑھیں، سیرت النبیؐ پر چند ایک کتابیں پڑھیں مجھے یاد ہے کہ میٹرک کا امتحان دینے کے بعد ابوالکلام آزاد کی تفسیر ترجمان القرآن خاص طور پر پوری پڑھ ڈالی شبلی نعمانی اور سلیمان ندوی سے ہوتے ہوئے جتنے حضرات کی کتب سیرت النبیؐ پر مل سکیں میں نے پڑھیں ہمارے دور میں طلبہ کا مطالعہ Broad base ہوتا تھا وہ صرف ایک مضمون ایک شعبہ تک محدود نہیں رہتے تھے بلکہ ہمہ جہتی اور متنوع موضوعات کا تھوڑا تھوڑا علم سبھی کے پاس ہوتا تھا علمی زندگی اور تحقیق کی دنیا میں قدم رکھنے کے بعد میں نے خاص طور پر اپنے لیے جو مضمون چنا وہ پاکستانیات ہے۔

پاکستانیات کو جب آپ چنتے ہیں تو ظاہر ہے آپ کو تحریک پاکستان بھی پڑھنی پڑتی ہے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ قائداعظم اور اقبال کو بھی اُس حوالے سے پڑھنا پڑھتا ہے اور پاکستان کی تاریخ وسیاست اُس کو میں نے خاص طور پر تحریر اور مطالعہ کا موضوع بنایا۔ مجھے یاد ہے کہ میں نے 1964ء میں ایم اے کا امتحان دیا 1965ء میں ہمارا رزلٹ نکلا اور اُسی سال میں گورنمنٹ کالج لاہور میں لیکچرر ہوگیا اور 1965ء میں روزنامہ نوائے وقت لاہور میں جو اُس وقت مغربی پاکستان کا سب سے بڑا اخبار ہوا کرتا تھا انہوں نے بدھ کے دن پورا آدھا Editorial page میرے لیے مخصوص کیا ہوا تھا اور میں اس اخبار میں گاہے گاہے بازخواں کے نام سے تاریخ پاکستان کے مختلف پہلوؤں پر لکھا کرتا تھا میری عمر اُس وقت 22، 23 برس تھی۔ اُس کے بعد میں نے پاکستانیات کو اپنا ایک مستقل موضوع بنا لیا اور اُس

کوموضوع بنانے میں بھی ایک واقعہ کا خاص عمل دخل ہے ایم اے میں میرا Thesis تھا مسلم لیگ کا دور حکومت 1947ء سے لے کر 1954ء تک بعد ازاں میں نے اس پر مزید محنت کی انڈیا آفس لائبریری میں بیٹھا واشنگٹن کے خفیہ پیپرز دیکھے، دنیا جہاں کا مواد کھنگال لینے کے بعد اس کی پُوری شکل ہی بدل گئی۔ اس کتاب میں زیادہ مواد طالب علمی کے دور کے بعد کا ہے۔ مصیبت یہ ہے کہ ہمارے ملک میں تحقیق کے لیے کوئی سہولت نہیں ہے۔ ہم اب بھی اُس لحاظ سے 1965 کے دور میں ہیں، میں ایک دفعہ انڈیا آفس لائبریری میں بیٹھا تھا تو میں نے ایک اسسٹنٹ سے کہا کہ میں نے London Times اخبار کا مطالعہ کرنا ہے 1947ء سے لے کر 1954ء تک میں یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ پاکستانی سیاست کے بارے میں لندن ٹائمز میں کیا خبریں، تبصرے اور تجزیے چھپے۔ لائبریرین نے مجھے کہا کہ its very simple۔ یہ انڈیکس پڑا ہوا ہے۔ انڈیکس کھولیں کتابوں کی صورت میں لندن ٹائمز کا انڈیکس انہوں نے چھاپا ہوا ہے ہر سال کا انڈیکس نکالو۔ اُس میں پاکستان نکالو اُس میں Politics نکالو اور صفحہ نوٹ کرلو۔ اخبار کا ریکارڈ مائیکرو فلم پر موجود ہے جو پڑھنا چاہتے ہو پڑھ لو۔ اس طرح وہ کام میں نے تقریباً سات دن میں مکمل کرلیا جبکہ پاکستان میں جب میں نے اخبارات دیکھنا شروع کئے تو پاکستان ٹائمز سول ملٹری گزٹ نوائے وقت، ڈھاکہ ٹائمز اور ڈان کی فائلیں پڑھنے میں کئی برس لگ گئے۔ ان اخبارات کا ایک ایک صفحہ مجھے پڑھنا پڑتا تھا اور اُس میں جو مجھے میرے کام کا مواد ہوتا تھا وہ ہاتھ سے کاپی پر نوٹ کرتا تھا اور اُس کے نتیجے میں اتنا مواد اکٹھا ہوا کہ ہمارے گھر میں رضائیوں والا صندوق میری کاپیوں اور رجسٹروں سے بھر گیا پاکستان میں Research کرنا گدھوں والا کام ہے آپ کو اندازہ ہی نہیں ہوتا کہ آپ کام کیسے کریں گے اکانومسٹ لندن کا جو بڑا معتبر رسالہ ہے میں نے ایک دن میں سات سال کی فائل پڑھ لی۔ ریسرچ کے دوران میں پاکستان ٹائمز کی لائبریری میں زرد بلب کے نیچے بیٹھ کر مٹی سے بھرے ہوئے اخبارات کا ایک ایک صفحہ اپنی انگلی سے الٹ کر پڑھتا تھا۔ پرانے اخبارات کی مٹی اور بو میری سانسوں کا حصہ بن جاتی تھی۔ وہاں میں نے گلے کی خرابی کا مستقل روگ پالا۔

میں نے پاکستانیات کو اپنا اوڑھنا بچھونا اس لیے بنایا کہ پاکستان کی محبت میرے رگ و پے میں موجود تھی۔ جس زمانے میں میں تحقیق کے لیے پاکستان ٹائمز کی لائبریری میں کام کر رہا تھا اُسی زمانے میں آکسفورڈ کا ایک طالب علم وہاں آیا ہوا تھا جو Political parties of pakistan کے عنوان پر Thesis لکھ رہا تھا۔ لائبریری میں صرف دو ہی تحقیق کرنے والے ہوتے تھے۔ ہماری آپس میں گپ شپ دوستی شروع ہوئی پھر میں اُسے کھانے پہ لے گیا، بے تکلفی ہوگئی وہ آدمی آکسفورڈ سے ڈاکٹریٹ کر رہا تھا اور یونی ورسٹی والوں نے Material اکٹھا کرنے کے لیے اُسے پاکستان بھیجا تھا۔ اس پر وہ بڑا Extensive کام کر رہا تھا ایک دن اُس نے باتوں باتوں میں مجھ سے پوچھا کہ کیا تم مجھے کوئی پاکستان میں ایک ایسی کتاب Suggest کر سکتے ہو جسے پڑھ کر میں پاکستان کے تمام پہلوؤں سے آشنا ہو جاؤں تو میں بغلیں جھانکنے لگا۔ اُس کے بعد مجھے بڑی شرم آئی کہ پاکستان بنے ہوئے 17 برس گزر چکے ہیں ہم نے کوئی کام ہی نہیں کیا تو پھر میں نے فیصلہ کیا کہ میں صرف پاکستان پر کام کروں گا اس طرح میں کام میں لگا رہا اور آج جو آٹھ، دس کتابیں ہیں وہ پاکستان کے مختلف پہلوؤں پر ہیں تحریک پاکستان کا مطالعہ، قائداعظم اور علامہ اقبال

کا مطالعہ اُس پس منظر کو سمجھنے کے لیے ضروری تھا چنانچہ میں نے اپنی حد تک ان موضوعات کو سمجھنے کی کوشش کی لیکن میرا مرکز ومحور مطالعہ پاکستان ہی رہا۔

میں گزشتہ کئی سالوں سے کوئی تحقیقی کتاب نہیں لکھ سکا میری زندگی کا تجربہ یہ بتاتا ہے اور میرے استاد منور صاحب یہی کہا کرتے تھے کہ جس وقت جو تمہارا جی چاہ رہا ہے۔ وہ لکھو، اگر افسانہ لکھنے پر طبیعت مائل ہو تو افسانہ لکھو شعر کہنا چاہتے ہو تو شعر لکھو، طنز ومزاح لکھنے کو جی چاہتا ہے تو وہ لکھو، بہرحال وہ ایک طرح سے میری تربیت کرتے رہے اب کچھ عرصے سے میں اپنے آپ میں ہمت نہیں کر پاتا اور نہ ہی طبیعت راغب ہوتی ہے کہ میں جم کر بیٹھ کر تحقیق کروں یا کوئی مستقل ریسرچ کروں جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے کہ میری آخری تحقیقی کتاب 1980ء میں آئی اور اس کے کوئی 8 دس سال کے وقفے کے بعد میری کتاب .....Pakistan Political Roots and Deue منظر عام پر آئی یہ کتاب آکسفورڈ نے شائع کی ہے۔ اور تقریباً پوری دنیا میں پھیل گئی ہے میں دنیا کی جس بھی لائبریری میں جاتا ہوں وہاں اپنی کتابیں دیکھ کر مجھے اس بات کی خوشی ہوتی ہے مثلاً امریکہ کی میں تقریباً سب بڑی یونیورسٹیوں میں گیا ہوں کولمبیا۔ برکلے میں نے امریکہ کی ہر یونیورسٹی لائبریری میں اپنی کتابیں دیکھی ہیں اُن کے پاس کئی ایسی کتابیں بھی ہیں جن کی کاپی میرے پاس بھی نہیں ہے۔ میں برکلے یونی ورسٹی میں گیا تو اُن کا ایک طریقہ ہوتا ہے Welcome کرنے کا وہاں ایک پروفیسر Steven Poulis ہے جو ساؤتھ ایشین ڈیپارٹمنٹ کا وائس چیئر مین ہے۔ اُس کے ساتھ ایک آدھ دن گپ شپ رہی اگلے دن اُس نے کہا کہ ہماری گریجوایٹ کلاسز کو تین چار لیکچرز دو پھر ایک دن اُس نے کہا کہ آؤ میں آپ کو لائبریری دکھاؤں وہ مجھے برکلے یونیورسٹی کی سنٹرل لائبریری میں لے گیا۔ برکلے یونیورسٹی دنیا میں عالمی سطح کی ایک یونیورسٹی مانی جاتی ہے اُس نے لائبریرین سے میرا تعارف کرایا کہ یہ ڈاکٹر صفدر محمود ہیں پاکستان سے آئے ہیں تو انہوں نے کہا Just wait اُس نے کمپیوٹر میں میرا نام انٹر کیا تو میری کتابوں کی لسٹ نکل آئی جو انہوں نے مجھے دے دی میرا بیٹا آسٹن میں پڑھتا تھا تو وہ کہتا ہے کہ ایک دن مجھے پاکستان پر ریسرچ کرنی تھی ریسرچ کرتے کرتے کہیں آپ کا نام سامنے آ گیا۔ کلک کیا تو آپ کی سب کتابیں میری لائبریری میں موجود تھیں مطلب یہ کہ میں جہاں بھی گیا مجھے میری کتابیں اُن لائبریریوں میں موجود ملیں یہی صورت میں نے جاپان میں بھی دیکھی لیکن اس کے بعد میں کالم نگاری کے چکر میں ایسا پھنسا کہ کتاب لکھنے کے لیے وقت ہی نہیں رہا۔

میں بڑی دیر تک سوچتا رہا کہ وہ کون سی ایسی کتاب ہو سکتی ہے جس نے مجھے بہت متاثر کیا ہو سچی بات تو یہ ہے کہ بہت سی کتابیں متاثر بھی کرتی رہیں کچھ کتابیں اپنی گہری تحقیق کی وجہ سے یا کچھ کتابیں اپنے جذبوں اور اسلوب کی وجہ سے کچھ کتابیں اپنے مشاہدات، فکر اور تاریخی حقائق کی وجہ سے بھی متاثر کرتی رہیں۔ سیکھتا بھی رہا لیکن اگر آپ مجھے یہ کہیں کہ کوئی ایسی کتاب کا نام بتائیں جس نے مجھے بہت زیادہ متاثر کیا ہو جس نے میرے ذہن پر مستقل اثرات چھوڑے ہوں وہ یاد نہیں پڑتی۔ میں علامہ اقبال سے بے حد متاثر ہوں تھوڑا بہت مولانا مودودیؒ صاحب کو بھی پڑھا ہے۔ تحریک پاکستان اور قائداعظم پر اب تک جتنی اچھی کتابیں اندرون بیرون ملک چھپی ہیں تقریباً سبھی کو میں نے پڑھا اور کچھ میں جھانکا لیکن ایسی کوئی کتاب جس نے مجھے جھٹکا دیا ہو یاد نہیں پڑتی۔

ابتدا میں مجھے ابوالکلام آزاد کو استاد نے پڑھایا تو ظاہر ہے کہ ابوالکلام آزاد نے سکول کی عمر میں مجھے بہت متاثر کیا۔ میٹرک کا امتحان دے کر چھٹیوں میں نسیم حجازی، پرم چند، منٹو اور دوسرے افسانہ نگاروں کو خوب پڑھا۔ ساتھ ہی ساتھ اقبال کی سوانح عمری پر اور سیرت النبیؐ پر بھی کتابیں پڑھتا رہا۔

میں ابتدا میں تو افسانے کا قاری تھا۔ یہ ایک لمبی فہرست ہے مثلاً قراۃ العین حیدر، راجندر سنگھ بیدی، پریم چند کو میں نے میٹرک کے بعد پڑھا اس طرح منٹو، حاجرہ مسرور اور خدیجہ مستور، احمد ندیم قاسمی کو کالج کے دور میں توجہ سے پڑھا۔ عصمت چغتائی کو بھی پڑھا لیکن ان افسانہ نگاروں میں مجھے جس شخص نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ سعادت حسن منٹو تھا۔ لیکن ایک ایک افسانہ مجھے شاید سب کا ہی یاد ہوگا۔ مثلاً کرشن چند کا تائی اسیری، بیدی کا ایک طویل ''اک چادر میلی سی'' مجھے آج تک یاد ہے۔ احمد ندیم قاسمی کا ایک افسانہ ''سناٹا'' اچھا لگا اشفاق احمد کا ''گدڑیا'' متاثر کر گیا لیکن اس دور میں جس افسانے نے متاثر کیا وہ تھا ''اکھیاں میٹ کے سینا تکیا'' میں یوں کہہ سکتا ہوں کہ جتنے افسانہ نگار قیام پاکستان سے لے کر 1970ء تک نمایاں ہوئے میں نے تقریباً ان سب کو پڑھا لیکن میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں نے سب کے افسانے پڑھے۔

شاعری میں اقبال نے فکری لحاظ سے بہت گہرا اثر ڈالا اور جدید شعرا میں فیض احمد فیض مجھے بہت پسند ہیں۔ اسرار الحق مجاز بہت پسند تھا، قاسمی صاحب کی شاعری کو بھی پڑھا۔ قتیل شفائی اور ساحر لدھیانوی کو بھی میں نے پڑھا اور خوب پڑھا نوجوانی میں ایک اسٹیج آتی ہے جب آپ کو ساحر لدھیانوی بہت پسند ہوتا ہے ''تلخیاں'' ہم بڑے ذوق شوق سے پڑھا کرتے تھے لیکن جو شاعر میرے ساتھ ساری زندگی رہے وہ اقبال اور فیض ہیں اور جب سیاست کے حوالے سے پڑھتا ہوں تو حبیب جالب بھی یاد آتا ہے۔

علاقائی زبانوں میں میں نے پنجابی میں صوفیانہ کلام پڑھا۔ میاں محمد بخشؒ، سلطان باہو، بابا فرید اور بلھے شاہ شوق سے مطالعہ کیا اور ان سے خاصا متاثر بھی ہوا ان صوفی شعراء کا بھی میرے مزاج پر گہرا اثر ہے بابا فرید اور سلطان باہو خاص طور پر۔ محسوس کرتا ہوں کہ میرے لاشعور میں بلھے شاہ کے کلام کا بھی اثر ہے میرے اندر روشنی کی ایک کرن پیدا کرنے یا بعد از زندگی کو سمجھنے میں اور عشق مجازی یا عشق حقیقی کو سمجھنے میں ان کا بہت اہم کردار ہے۔ افسانوی ادب میں متاثر کرنے والا اشفاق احمد کا افسانہ گڈریا ہے جسے میں کبھی نہیں بھول سکا اُس میں ایک کردار تھا باؤ جی۔ اُس نے مجھے بہت متاثر کیا یہ اُن افسانوں میں سے ہے جنہوں نے میرے ذہن پر ٹیچر کی Dedication کے حوالے سے نقوش مرتب کیے۔ استاد کی Commitment کیا ہونی چاہیے اس افسانے کو پڑھ کر سمجھ آتی ہے۔

گورنمنٹ کالج لاہور کے رسالے ''راوی'' کے صد سالہ اور ایک سو پچیس سالہ انتخابات کتابی صورت میں چھپ چکے ہیں۔ مجھے یہ اعزاز حاصل ہے کہ طنز و مزاح کے انتخاب میں بھی میرا مضمون شامل ہے اور افسانوں کے انتخاب میں بھی میرا افسانہ شامل ہے۔ صد سالہ اور ایک سو پچیس سالہ انتخاب میں شامل ہونا ایک اعزاز ہے۔

طنز و مزاح میں مشتاق احمد یوسفی کو پڑھا۔ یلدرم کا ایک مضمون مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ بہت اچھا لگا پھر اُس کے بعد کرنل محمد خان کی جنگ آمد بجنگ آمد بہت اچھی لگتی ہے۔ مشتاق یوسفی کی پہلی دو کتابیں چراغ تلے اور خاکم

بدہن مجھے بہت اچھی لگیں، شوکت تھانوی کالم نگاری کی حد تک ٹھیک تھے لیکن پطرس تو سرتا پا فطری مزاح ہے جو مجھے بے حد پسند ہے۔ پطرس کا مزاح کبھی باسی نہیں ہوتا۔ شفیق الرحمان صاحب کو بھی میں نے پڑھا کرنل محمد خان اور ضمیر جعفری کے تو میں طویل عرصے تک ساتھ بھی رہا کسی زمانے میں کرنل محمد خان، ضمیر جعفری اور میں نے مل کر راولپنڈی سے طنز و مزاح کا ایک بہت معیاری سہ ماہی رسالہ ''اردو پنچ'' نکالتے تھے ''اردو پنچ'' میں اعلیٰ معیار کے مزاحیہ مضامین شامل ہوا کرتے تھے کرنل محمد خان اپنے ذاتی تعلق کی بنیاد پر شفیق الرحمٰن سے اور مشتاق یوسفی سے اور باقی دوستوں سے بھی مضامین لینے میں کامیاب ہو جایا کرتے تھے طویل عرصے تک کرنل محمد خان ضمیر جعفری صفدر مسعود سلطان رشک اُس کے ایڈیٹر رہے یہ رسالہ کئی برس تک چھپتا رہا۔ اُس زمانے میں اس کی دھوم تھی۔ شاعروں میں انور مسعود صاحب ہیں انعام الحق جاوید ہیں جو طنزیہ مزاحیہ شاعری کرتے ہیں مجھے پسند ہیں ضمیر جعفری صاحب کے بعض قطعات اور رباعیات زبان زد عام ہیں مجھے یاد بھی ہیں اور میں نے انہیں جعفری صاحب کی زبان سے سنا بھی ہے۔

کوئی ایک نہیں جس کا بہت اثر ہوا ہو میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ ہر لکھاری اپنے اپنے انداز کے مطابق کچھ نہ کچھ اثرات چھوڑتا چلا گیا۔

موجودہ کالم نگاروں میں مجھے جاوید چودھری، عطاالحق قاسمی اور عبدالقادر حسن پسند ہیں باقی کالم نگاروں کے کالموں میں بھی روزانہ جھانکتا ہوں کہ یہ ایک مجبوری ہے عطاالحق قاسمی جب سیاست پر لکھتے ہیں تو وہ مجھے اپیل نہیں کرتا۔ مجھے ان کا ادبی اور مزاحیہ کالم پسند آتا ہے۔ جب کہ جاوید چودھری کے کالم مجھے عام طور پر اچھے لگتے ہیں۔ اخبارات میں تقریباً سارے ہی دیکھتا ہوں اور پھر انتخاب کرتا ہوں کہ ان میں کن مضامین کو پڑھنا ہے۔

دوران سفر بڑے لفظ کے پرنٹ والی کوئی ادبی کتاب اپنے ساتھ رکھتا ہوں تاکہ عینک نہ لگانی پڑے، فلسفہ، ادب مذہبی کتاب زیادہ پسند آتی ہے زندگی میں کبھی کتاب کے بغیر میں نے سفر نہیں کیا یہ الگ بات کہ بعض اوقات کتاب ساتھ تو رہی پڑھی نہ جا سکی۔

زمانہ طالب علمی میں حافظہ کی صورت یوں تھی کہ شعر پاس سے بھی گزرتا تو مجھے یاد ہو جاتا تھا اب صورت یہ ہے کہ بعض شعر جو مجھے بہت اچھے لگتے ہیں یاد نہیں رہتے۔ منیر نیازی، ناصر کاظمی کو میں بہت بڑا شاعر سمجھتا ہوں اب تک مجھے جتنے بھی شعر یاد ہیں وہ تقریباً وہی ہیں جو جوانی تک میں نے پڑھے تھے، اب تو بعض اوقات کسی شعر کو لکھتے وقت تسلی کے لیے دیوان دیکھنا پڑتا ہے۔ جب سے میرا رجحان پاکستانیات کی طرف ہوا ہے اور یہ میرے قلب و ذہن کا حصہ بنا ہے۔ پاکستان کے بارے میں اکثر حوالے اور تاریخیں تقریباً 90 فی صد یاد ہیں، چنانچہ اب شعر و شاعری اور ادب پیچھے رہ گئے ہیں اور صورت حال یہ ہو گئی ہے کہ مجھے اپنے حافظہ سے یہ شکایت رہتی ہے کہ بہت سی چیزیں یاد نہیں رہتیں۔ جوانی کے دور میں حفیظ جالندھری، پروفیسر منور، شورش کاشمیری، حمید جالندھری، مجیب الرحمٰن شامی، فتح محمد ملک، منور حسین یاد، صادق حسین، ڈاکٹر جمیل جالبی، ڈاکٹر وحید قریشی، قیوم نظیر، اکرام رانا، محمد طفیل نقوش، ضمیر جعفری سے محفلیں رہتی تھیں لیکن وقت نے ان محفلوں کو ویران کر دیا۔

مطالعہ کے دوران نوٹس لینے کی عادت نہیں تھی۔ اب کچھ عرصے سے مجھے یہ شکایت شروع ہوئی ہے کہ میرا حافظہ

میرا ساتھ نہیں دیتا چنانچہ پچھلے سات آٹھ سال سے جو کتاب پڑھ رہا ہوتا ہوں اُس کے آخری Blank page پر میں اپنا انڈیکس بنانا شروع کر دیتا ہوں میں قلم سے لکھنا شروع کر دیتا ہوں کہ فلاں صفحے پر یہ بات تحریر ہے یہ انڈکس سوالوں کے کام آتا ہے۔

ذاتی لائبریری میں کتابوں کی تعداد کبھی گنی نہیں ہے۔تقریباً 3 چار سو کتابیں تو ایک لائبریری کو Donate کر چکا ہوں جن کے بارے میں میرا خیال تھا کہ اب ان کے حوالوں کی ضرورت نہیں رہی اور اب جو میرے پاس کتابیں ہیں یہ وہ کتابیں ہیں جو میرے مرنے کے بعد میری اولاد کسی لائبریری کو Donate کر دے گی یا ردی میں بیچے گی لیکن نہیں میں اپنی لائبریری کو صدقہ جاریہ کے طور پر کسی لائبریری کے حوالے کروں گا تا کہ طلبہ اور ریسرچ سکالرز اس سے استفادہ کر سکیں۔

میرے بچے بچپن سے ہی میرے مطالعے میں شریک رہے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ میرے بچے چار میں سے تین ایسے ہیں جو ملکی معاملات میں بڑی گہری دل چسپی رکھتے ہیں چوتھا بچہ انفارمیشن ٹیکنالوجی میں گم ہو چکا ہے۔بچپن سے ان کے ساتھ میں باتیں Share کرتا رہا ہوں ان کو واقعات سناتا رہا ہوں اور ان کے ذہنوں میں پاکستانیات کے نئے مستقل جگہ بناتا رہا ہوں۔اُن میں ایک بیٹا تو اتنا involve ہے کہ امریکہ میں رہنے کے باوجود بھی چاہتا ہے کہ پاکستانی سیاست میں کسی انقلابی پارٹی کو جوائن کرے۔گزشتہ دنوں وہ تحریک انصاف کا سرگرم رکن تھا جو پیچھے ہٹ گیا۔

میرا تجربہ یہ ہے کہ کتاب بڑی مہربان شے ہوتی ہے اس کو جو بھی اغوا کر کے لے جائے یہ احتجاج نہیں کرتی یہ ایک دفعہ لائبریری سے نکل جائے تو عام طور پر واپس نہیں آتی میری کتابیں جو لوگوں نے مستعار لیں وہ کبھی واپس نہیں کیں اور بعض دوست ایسے بھی ہیں جو وقتاً فوقتاً مجھے کہتے رہتے ہیں کہ تمہاری فلاں کتاب میں نے واپس کرنی ہے لیکن میرے بعض ایسے دوست بھی ہیں جن سے بعض اوقات میں نے کتاب لی اور اگر وہ کتاب میرے مضمون سے متعلق ہو تو میں کہہ دیتا ہوں کہ یہ تمہیں واپس نہیں ملے گی۔

مجھے تحریک پاکستان، قائداعظم، اقبالیات اور پاکستان کی تاریخ وسیاست پر کتابوں کی تلاش رہتی ہے۔اُس میں بعض اوقات مجھے دقت اس لیے نہیں ہوتی کہ یہ ایسے موضوعات ہیں جن پر کتابیں پاکستانی مارکیٹ میں مل جاتی ہیں ورنہ امریکہ یا برطانیہ میں کسی دوست سے منگوا لیتا ہوں۔تحریک پاکستان کے جذبے سے میری وابستگی کا یہ عالم ہے کہ میں جب حکومت پنجاب میں سیکرٹری اطلاعات وثقافت (89-1986) تھا تو میں نے پاکستان کی تاریخ میں پہلی دفعہ تحریک پاکستان کے مجاہدوں، کارکنوں اور قائداعظم کے سپاہیوں کی عزت افزائی اور پہچان کے لیے انہیں طلائی تمغے دینے اور ان کی دیکھ بھال کا سلسلہ شروع کیا۔یہ سلسلہ میں نے میاں نواز شریف کی سرپرستی میں 1987 میں شروع کیا جس سے ملک بھر میں جوش وخروش پیدا ہوا۔1990 میں جناب غلام حیدر وائیں وزیر اعلیٰ بنے تو اسے ٹرسٹ کی حیثیت سے رجسٹر کروایا گیا اور وائیں صاحب نے اس ٹرسٹ کے لیے نہ ہی صرف عمارت تعمیر کروائی بلکہ فنڈ زبھی دیئے۔شکر الحمد للہ کہ سرکاری ملازمت کے دوران رزق حلال کھایا، اصولوں کی پاسداری کی اور حاکموں کی خوشامد سے دور رہا۔اللہ کا شکر ہے کہ ذہن پر کسی زیادتی کا بوجھ نہیں اور سکون کی نیند سوتا ہوں۔عمر بھر قومی وملکی خدمت کو اولین ترجیح بنائے رکھا۔

نامور لکھاریوں کے ساتھ ساتھ صوفیا اور اولیا اکرام کی مجلسیں بھی نصیب ہوئیں۔ حکمرانوں سے لڑائیاں بھی ہوتی رہیں اور اس کی سزا بھی ملتی رہی لیکن میں نے ہمیشہ مشاہدہ اور تجربہ کیا کہ بچانے والا مارنے والے سے کہیں زیادہ طاقت ور ہے ورنہ جنرل ضیاء الحق، جنرل مشرف اور بے نظیر بھٹو میری تنقیدی تحریروں سے سیخ پا بھی رہے لیکن خواہش کے باوجود نوکری سے نہ نکال سکے کیوں کہ بچانے والا میرے ساتھ تھا۔

یہ ایک قدرتی بات ہے اس کو آپ ارتقائی عمل کہہ لیں جیسے جیسے آپ تحقیقی کتابیں پڑھتے ہیں اس سے آپ کی معلومات میں بھی اضافہ ہوتا ہے اور آپ کے فہم وادراک کی بھی تشکیل ہوتی ہے۔ بعض چیزوں کے بارے میں آپ کی رائے بہتر سے بہتر اور بعض چیزوں کے بارے میں آپ کے رائے بدل جاتی ہے مثلاً یہ ایک بڑی عجیب وغریب بات ہے اور میں اس کو کہہ دینا مناسب سمجھتا ہوں۔ اس بارے میں میری Controversies بھی چلتی رہتی ہیں۔ مثلاً یہ کہ میں طویل عرصے تک قائداعظم کو مغربی طرز کی ماڈرن شخصیت سمجھتا رہا سیکولر قسم کی شخصیت لیکن بہت سی چیزیں پڑھنے اور مواد کے دریا میں اترنے کے بعد پتہ چلا کہ قائداعظم کے اندر ایک سچا مسلمان موجود تھا جس کی طرف ہماری نظر بہت کم گئی ہے مجلس ترقی ادب نے قائداعظم کی تقاریر پر چار جلدیں شائع کی ہیں اگر آپ پڑھیں تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ قائداعظم کی شخصیت کیا ہے جب میں نے ان کی ذاتی زندگی کو اندر سے جھانکا تو میری رائے ان کے بارے میں پہلے سے مزید بہتر ہوگئی ہے۔

ایسی کتابیں جن میں وطن عزیز پاکستان کے بارے میں مایوسی اور ناامیدی پھیلائی گئی ہو وہ میری ناپسند کی فہرست میں آتی ہیں۔ مثلاً طارق علی کی بعض کتابیں ایسی متعصب کتابیں جو 1971ء کی Tragedy کے بارے میں لکھی گئی ہیں۔ باقی مطالعہ کے لیے سیرۃ النبی شبلی نعمانی اور سید سلمان ندوی کی کتابیں مجھے بے حد پسند ہیں اور تفاسیر میں تفہیم القرآن مجھے بہت پسند ہے۔ فلسفے اور سیاسیات اور پاکستانیات پر کتابیں شوق سے پڑھتا ہوں۔ دل میں ایک آواز تڑپتی رہتی ہے کہ مرنے سے قبل کوئی بڑی قومی خدمت کر جاؤں اور کسی ایسے صدقہ جاریہ کی بنیاد رکھ جاؤں جو بخشش اور روحانی بلندی کا ذریعہ بنے۔ اب تک اسی آرزو کی تکمیل کے لیے زندہ ہوں۔ دیکھئے خدا کو کیا منظور ہے کیوں کہ اس کی رضا کے بغیر ایسے کام نہیں ہو سکتے۔

الشریعہ اکادمی کی لائبریری کے لیے موصول ہونے والے ہدیہ ہائے کتب

- الکنز المتواری فی معادن لامع الدراری (صحیح بخاری پر شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا سہارنپوریؒ کے تشریحی افادات) ۲۴ جلدیں (ہدیہ از جناب مولانا عبد الحفیظ مکی مدظلہ، سعودی عرب)
- مشاہیر (مکتوبات) بنام مولانا سمیع الحق (۸ جلدیں) ہدیہ از جناب مولانا سمیع الحق زید مجدہم
- طبقات القراء للذہبیؒ (۲ جلدیں) ہدیہ از جناب ڈاکٹر احمد خان صاحب، اسلام آباد

ادارہ ان گراں قدر کتب کا ہدیہ پیش کرنے پر مذکورہ تمام حضرات کا شکر گزار اور ان کے لیے دعا گو ہے۔

محمد عمار خان ناصر

خاطرات

مولانا محمد اسلم شیخوپوریؒ

مولانا محمد اسلم شیخوپوری سے میرا پہلا تعارف - جو غائبانہ تھا اور آخر وقت تک بنیادی طور پر غائبانہ ہی رہا - ۹۰ء کی دہائی میں اپنے زمانہ طالب علمی کے اواخر میں ہوا جب ''ندائے منبر ومحراب'' کے عنوان سے ان کا سلسلہ خطبات منظر عام پر آنا شروع ہوا۔ مجھے تقریر وخطابت سے اور خاص طور پر اس کے مروجہ اسالیب سے طبعی طور پر کبھی مناسبت نہیں رہی، تاہم مولانا شیخوپوری کے سنجیدہ اور بامقصد انداز گفتگو کا ایک اچھا تاثر ذہن پر پڑنا یاد ہے۔ شاید اس زمانے میں اس سلسلے کی کچھ جلدیں بھی نظر سے گزری ہوں۔

۹۰ء کی دہائی میں ہی والد گرامی کے ساتھ پہلی مرتبہ کراچی جانا ہوا تو جامعہ بنوریہ سائٹ کراچی کے دورے کے موقع پر مولانا شیخوپوری کی زیارت بھی ہوئی جوان دنوں وہاں استاذ حدیث تھے اور غالباً صحیح مسلم کی تدریس کر رہے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کا ''مکتبہ حلیمیہ'' کے نام سے کتابوں کی اشاعت کا بھی ایک چھوٹا سا نظم تھا اور وہ اپنی بعض مطبوعات وقتاً فوقتاً والد گرامی کی خدمت میں بھیجتے رہتے تھے۔ چند سال قبل والد گرامی ہی کی معیت میں کراچی کے ایک سفر میں ہم جامعۃ الرشید میں ٹھہرے اور مفتی ابولبابہ شاہ منصور، مولانا سید عدنان کاکاخیل اور دیگر حضرات کی پرتکلف میزبانی کا لطف اٹھاتے رہے۔ حسن اتفاق سے ان دونوں مولانا شیخوپوری جامعۃ الرشید میں تدریسی خدمات سرانجام دے رہے تھے اور جامعہ ہی کے رہائشی کوارٹر میں مقیم تھے۔ ہمارے فاضل دوست مولانا احسان الحق تبسم بھی کئی سال سے یہیں تعلیم وتدریس میں مصروف ہیں۔ ایک موقع پر ان کی رہائش گاہ کی طرف جاتے ہوئے راستے میں مولانا شیخوپوری سے بھی مختصر سلام دعا ہوئی جو (پیدائشی معذوری کے باعث) اس وقت وہیل چیئر پر مسجد کی طرف جا رہے تھے۔

ان دو مختصر ملاقاتوں کے علاوہ مولانا کے ساتھ کبھی تفصیلی ملاقات یا تبادلہ خیالات کا موقع میسر نہیں آیا، تاہم غائبانہ تعارف اور سلام وپیغام کا تعلق قائم تھا اور ایک آدھ دفعہ فون پر بھی ان سے بات ہوئی۔ دو تین سال قبل وہ خطبہ جمعہ کے لیے گوجرانوالہ میں کسی جگہ تشریف لائے تو ایک طالب علم کے ذریعے سے سلام بھیجا اور میرے مرتب کردہ خطبہ حجۃ الوداع کے متن کا نسخہ طلب فرمایا جو والد گرامی کے توضیحی محاضرات کے ساتھ الشریعہ اکادمی کی طرف سے شائع ہوا ہے اور دلچسپ بات یہ ہے کہ طبقہ علماء کی عام روایت کے برخلاف استحقاقاً نہیں بلکہ قیمتاً طلب فرمایا۔

مولانا کے مزاج اور طرز فکر میں ایک خاص بات یہ تھی کہ اکابر دیوبند کے منہج فکر سے پختہ وابستگی کے باوجود ان کے ہاں ''مسلکیت'' کا وہ سطحی انداز دکھائی نہیں دیتا تھا جس کا تناسب دیوبندی مکتب فکر میں اب خاصا بڑھتا جا رہا ہے، بلکہ طبقاتی ہمدردیاں حاصل کرنے کا سستا ترین نسخہ بنتا جا رہا ہے۔ مولانا شیخوپوری نے اپنی محنت کے لیے درس وتدریس اور عوامی اصلاح کا اور گزشتہ کئی سالوں سے درس قرآن اور مستقل اخباری کالم تحریر کرنے کا میدان منتخب کیا اور بڑے اعتدال اور توازن کے ساتھ دین کا پیغام مثبت انداز میں لوگوں تک پہنچاتے رہے۔

مولانا کے متوازن انداز فکر کا اندازہ دو مثالوں سے لگایا جا سکتا ہے۔ چند سال قبل انھوں نے ''درس صحیح مسلم'' کے نام سے جناب مولانا محمد تقی عثمانی کی معروف عربی تصنیف ''تکملہ فتح الملہم'' کے مباحث کی اردو تلخیص مرتب کی۔ ہمارے ہاں مدارس میں درس حدیث عام طور پر فقہی معرکہ آرائیوں کا عنوان ہوتا ہے اور احناف ہوں یا اہل حدیث، اساتذہ کی تقاریر وتحقیقات کا مطمح نظر ہر حال میں احادیث کی رو سے اپنے فقہی مسلک کی ترجیح ثابت کرنا ہوتا ہے۔ مولانا تقی عثمانی کے ہاں یہ اسلوب نہیں ہے۔ مولانا کی درسی تقاریر کا مجموعہ ''درس ترمذی'' اس پہلو سے حدیث کے طلبہ کے لیے بہت مفید ہے اور خود میں نے زمانہ طالب علمی میں اس سے بے حد استفادہ کیا ہے۔ مولانا عثمانی کے ہاں وسعت ظرفی کے اس رجحان پر ''ٹھیٹھ مسلکی'' طبقوں میں زیادہ اطمینان نہیں پایا جاتا اور میں نے بعض حضرات کو یہ تک کہتے ہوئے سنا ہے کہ مولانا تقی عثمانی ''مسلک کی جڑیں کاٹنے کی کوشش کر رہے ہیں۔'' خیر، مولانا محمد اسلم شیخوپوری نے ''درس صحیح مسلم'' کے عنوان سے مولانا عثمانی کی تحقیقات کا ایک بڑا عمدہ اور جامع خلاصہ مرتب کیا تو اس کے مقدمے میں بڑی وضاحت سے لکھا کہ:

> ''تکملہ کی سب سے نمایاں خصوصیت اس کا خالص علمی اور تحقیقی انداز ہے جس میں مسلکی تعصب اور مناظرانہ حجت بازی کا شائبہ تک نہیں پایا جاتا۔ الشیخ عثمانی مدظلہم نے کتاب کے مقدمہ میں اپنے والد ماجد مفتی اعظم پاکستان مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہ کے حوالہ سے ایک جملہ لکھا ہے جو حقیقت میں آب زر سے لکھنے کے قابل ہے۔ انھوں نے طلباء کی ایک جماعت سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا: ''تم اگر فقہی مذہب کے اعتبار سے حنفی بن جاؤ تو کوئی حرج نہیں، لیکن احادیث نبویہ کو حنفی بنانے کی کبھی کوشش نہ کرنا۔''
>
> حضرت مولف نے اپنے والد ماجد نور اللہ مرقدہ کی اس زریں نصیحت کو تکملہ کے ہر ہر باب میں ملحوظ رکھا ہے اور جہاں کہیں دلائل کے اعتبار سے کسی دوسرے امام کا مسلک قوی نظر آیا ہے تو بلا چون وچرا اس کا اظہار کر دیا ہے اور اپنی حنفیت کو اظہار حق میں آڑے نہیں آنے دیا اور ایسا ایک دو جگہ نہیں، متعدد مسائل میں کیا ہے۔'' (ص ۲۶)

مولانا کے علمی وتحقیقی مزاج اور فکری وسعت نظر کی دوسری مثال خود راقم الحروف کے خیالات ورجحانات سے تعلق رکھتی ہے۔ ۲۰۰۸ء میں ''حدود وتعزیرات - چند اہم مباحث'' کے عنوان سے میری تصنیف منظر عام پر آئی تو میں نے بہت سے دوسرے اہل علم کے علاوہ مولانا شیخوپوری کو بھی اس کا ایک نسخہ بھجوایا۔ اس کتاب میں درج میرے بعض نتائج فکر کے حوالے سے بہت سے حضرات کے شدید ردعمل سے 'الشریعہ' کے قارئین بخوبی واقف ہیں۔ تاہم اس پوری فضا میں مولانا شیخوپوری کا تبصرہ حیرت انگیز طور پر بالکل مختلف تھا۔ انھوں نے کتاب کا مطالعہ کرنے کے بعد میرے نام ایک خط تحریر کیا جو 'الشریعہ'

کے نومبر/دسمبر ۲۰۰۸ء کے شمارے میں چھپ چکا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس موقع پر اپنی تعریف کے پہلو سے نہیں، بلکہ مولانا مرحوم کے انداز نظر کی وسعت اور توازن کو واضح کرنے کے لیے اسے دوبارہ نقل کر دیا جائے۔ مولانا نے لکھا:

''برادرم مولانا محمد عمار خان ناصر صاحب زید مجدہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کی وقیع اور قابل قدر علمی کاوش ''حدود وتعزیرات'' کے عنوان سے وصول ہوئی۔ اس کتاب کا ہر عنوان اور ہر صفحہ گواہی دیتا ہے کہ آپ نے اخذ واستنباط، محنت اور جستجو کا حق ادا کیا ہے۔ بڑا نازک موضوع تھا جس پر آپ نے قلم اٹھایا مگر مشکل مقامات سے جس طرح آپ دامن بچا کر نکلے ہیں، اس نے صغرسنی کے باوصف علمی حلقوں میں آپ کا قد بہت اونچا کر دیا ہے۔ ''شاب شیخ'' کی ترکیب بجا طور پر آپ پر صادق آتی ہے۔ مخدوم ومحترم حضرت مولانا زاہد الراشدی صاحب دامت برکاتہم خوش نصیب ہیں کہ انھیں آپ جیسا ذہین وفطین اور مطالعہ کا شوقین فرزند عطا ہوا۔

یقیناً آپ کی تحقیق کے بعض نتائج سے اختلاف کیا جائے گا اور اختلاف کرنا بھی چاہیے کہ اختلاف رحمت ہے اور خوب سے خوب تر کو سامنے لانے میں اہم کردار ادا کرتا ہے، مگر شرط یہ ہے کہ اختلاف، اختلاف ہی رہے، ضد اور خلاف میں تبدیل نہ ہو جائے۔ امید ہے کہ آپ بھی دلائل کی بنیاد پر کیے جانے والے اختلاف کو خندہ پیشانی سے برداشت کریں گے اور اپنے موقف میں لچک پیدا کرنے میں کسی قسم کی ہچکچاہٹ ظاہر نہیں کریں گے۔

دعا ہے کہ باری تعالیٰ شرور وفتن سے آپ کی حفاظت فرمائے اور آپ کے علم، قلم، زبان اور ذہنی صلاحیتوں سے امت مرحومہ کو بیش از بیش فائدہ پہنچے۔''

مولانا نے میری تعریف میں جو الفاظ درج کیے ہیں، ان کی اہمیت میری نظر میں ثانوی ہے اور بدیہی طور پر وہ حقیقت واقعہ سے زیادہ مولانا کے حسن ظن اور علمی قدر افزائی کے جذبے کی غمازی کرتے ہیں، لیکن اس سے علمی وتحقیقی مباحث کے ضمن میں ان کا جو زاویہ نظر سامنے آتا ہے، وہ ان کے طبقے کے علما میں یقینی طور پر ایک جنس نایاب ہے۔

مولانا محمد اسلم شیخوپوریؒ کا قتل اس سلسلہ کشت وخوں کی ایک تازہ کڑی ہے جو ہمارے ہاں مذہب، نسل اور قومیت کے نام پر ایک طویل عرصے سے جاری ہے۔ کراچی میں یہ تمام عوامل یکجا ہیں، اس لیے یہ متعین کرنا مشکل ہے کہ مولانا کے قاتلوں کے نزدیک ان کا جرم سنی ہونا تھا یا دیوبندی یا پنجابی یا اعتدال پسند یا کچھ اور۔ پس منظر جو بھی ہو، نتیجہ بہرحال ایک ہی ہے کہ معاشرہ ایک جید، صاحب کردار، متوازن خیالات ورجحانات کے حامل اور نہایت موثر اور مثبت انداز میں دین کی دعوت وتبلیغ کا فریضہ انجام دینے والے ایک عالم دین سے محروم ہو گیا ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اللھم لاتحرمنا اجرہ ولا تفتنا بعدہ۔

مختلف کلامی تعبیرات کی حقیقت اور ان سے استفادہ کی گنجائش

ابوعثمان عمرو بن بحر بن محبوب الجاحظ (۱۶۳--۲۵۵ھ) دوسری/تیسری صدی ہجری کا ایک باکمال ادیب اور متکلم ہے۔ اس کا شمار معتزلہ کے ائمہ اور کبار میں ہوتا ہے، تاہم اس کی تحریروں سے واضح ہوتا ہے کہ وہ نہ صرف نصوص کی

اتباع اور عقل وقیاس کی رعایت کے مابین توازن کی اہمیت کو تسلیم کرتا ہے، بلکہ مختلف ذہنی وفکری سطحوں کی دینی ضروریات کے لحاظ سے اپنے اپنے دائرے میں معتزلہ اور متکلمین کے الگ الگ مناہج کی افادیت کا بھی معترف ہے، چنانچہ اس نے لکھا ہے کہ: لولا مکان المتکلمین لهلكت العوام من جميع الامم ولولا مكان المعتزلة لهلكت العوام من جميع النحل (کتاب الحیوان، ص۵۲۷ وص۹۳۷، طبع دار الکتاب العربی بیروت، ۲۰۰۸ء)۔ ''اگر متکلمین نہ ہوتے تو تمام امتوں (یعنی مذاہب) سے تعلق رکھنے والے عوام (یعنی ان کا عقیدۂ وایمان) برباد ہو جاتا اور اگر معتزلہ نہ ہوتے تو (دائرۂ اسلام میں داخل) تمام مذہبی گروہ (یعنی ان کا عقیدۂ وایمان) تباہ ہو جاتا۔'' جاحظ کی مراد یہ ہے کہ متکلمین کے ہاں نصوص سے قریب تر رہنے کے جس منہج کو ترجیح دی گئی ہے، اس میں عوام الناس کی ذہنی سطح کی زیادہ رعایت پائی جاتی ہے اور انھیں دین وایمان سے وابستہ رکھنے کے لیے یہی طریقہ مفید اور موثر ہے، لیکن ایک مختلف ذہنی سطح پر دینی حقائق پر غور وفکر سے مسلمانوں کے جو کلامی فرقے وجود میں آئے ہیں، ان کی تشفی متکلمین کے طریقے سے نہیں ہو سکتی اور ان کے لیے معتزلہ کا طریقہ ہی راہ نجات کا درجہ رکھتا ہے۔

کلامی نوعیت کے بیشتر اختلافات اور نزاعات کی اصل حقیقت یہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اہل علم دینی وعلمی مصالح کے تناظر میں بوقت ضرورت ایسی تعبیرات سے بھی استفادہ کرتے رہے ہیں جنھیں عام طور پر 'اہل السنۃ' کے منہج سے ہٹا ہوا قرار دیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر قرآن مجید کے 'معجز' ہونے کا مطلب اہل سنت کے متکلمین کے نزدیک یہ ہے کہ یہ کلام اپنے اندر داخلی طور پر ایسے کمالات واوصاف رکھتا ہے کہ اس کی نظیر پیش کرنا کسی فرد بشر کے بس میں نہیں۔ اس کے برعکس معتزلہ کا مسلک یہ بیان کیا جاتا ہے کہ قرآن کے اعجاز کا تعلق داخلی اوصاف سے نہیں، بلکہ اس بات سے ہے کہ اگر کوئی انسان اس کی مثل کلام بنانے کی کوشش کرتا ہے تو فی نفسہ ممکن ہونے کے باوجود اللہ تعالیٰ اپنی قدرت سے اسے ایسا کرنے سے عاجز کر دیتے ہیں۔ امام رازی نے قرآن کی مختصر سورتوں میں اعجاز کا پہلو واضح کرتے ہوئے اسی تعبیر کی مدد لی ہے۔ ابن کثیرؒ نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

> وهذه الطريقة وان لم تكن مرضية لان القرآن فى نفسه معجز لا يستطيع البشر معارضته كما قررنا الا انها تصلح على سبيل التنزل والمجادلة والمنافحة عن الحق (تفسیر ابن کثیر، البقرہ، آیت ۲۳، ۲۴)
>
> ''اگرچہ یہ طریقہ پسندیدہ نہیں ہے، کیونکہ ہم واضح کر چکے ہیں کہ قرآن فی نفسہ معجز ہے اور انسانوں کے لیے اس کی نظیر پیش کرنا ممکن نہیں، تاہم بر سبیل تنزل اور حق کا دفاع کرتے ہوئے اس طریقہ استدلال کو اختیار کرنا درست ہے۔'' اسی طرح مولانا اشرف علی تھانویؒ نے اپنے دروس ترمذی میں ایک جگہ فرمایا ہے کہ صفات باری تعالیٰ کے بارے میں سلف کا مسلک امرار علی الظاہر اور عدم تاویل تھا (بلکہ ایک خاص دور میں اسے راہ راست اور گمراہی کے مابین امتیاز کی حیثیت حاصل رہی ہے)، تاہم متاخرین نے تاویل کے طریقے کو عوام کی ذہنی سطح کے زیادہ قریب پاتے ہوئے مصلحت کی خاطر اسی مسلک کو اختیار کر لیا۔

مختلف ذہنی سطحوں اور ہر زمانہ کے خاص ذہنی معیارات کے لحاظ سے دینی حقائق ومسائل میں تعبیرات کا یہ تنوع اور

اختلاف ہر دور کی دینی ضرورت رہا ہے اور رہے گا، اس لیے دینی علوم کے طلبہ اور اساتذہ کو ذمہ داری کے ساتھ یہ بات گہرائی میں جا کر سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے کہ ان کے ماحول میں ان کے ذہن وفکر کے لیے نامانوس جو دینی تعبیرات پیش کی جا رہی ہیں، ان میں سے کون سی فی الواقع کفر اور الحاد وزندقہ کے دائرے میں آتی ہیں اور کون سی ایسی ہیں جن کا اصل محرک دینی حقائق کو کسی خاص فکری وذہنی سطح کے لیے مانوس بنانا ہے اور جن سے ایک خاص دائرے میں استفادہ بھی کیا جا سکتا ہے۔ واللہ اعلم

قربانی کے ایام

عید الاضحیٰ کے موقع پر قربانی کے ایام کے ضمن میں جمہور فقہا کی رائے یہ ہے کہ یہ تین دنوں (یعنی دس، گیارہ اور بارہ ذی الحجہ) میں ہی کی جا سکتی ہے، جبکہ چوتھے دن کی قربانی معتبر نہیں۔ امام مالک نے اس کی تائید میں سیدنا علی اور عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہم کے اقوال نقل کیے ہیں (موطا، ۱۰۳۵، ۱۰۳۶) اور عام طور پر اس بحث میں انھی سے استدلال کیا جاتا ہے۔ گزشتہ دنوں امام ابن ابی شیبہ کی 'المصنف' کے مطالعہ کے دوران میں کتاب الحج میں ایک روایت نظر سے گزری جس میں یہی رائے زیادہ صریح الفاظ میں سیدنا عمر سے نقل کی گئی ہے۔ چونکہ ان کا یہ قول قربانی کے ابواب کے بجائے کتاب الحج میں ایک دوسرے مسئلے کے تحت ضمناً نقل ہوا ہے، اس لیے غالباً اہل علم کی اس طرف توجہ نہیں ہو سکی اور متداول علمی مآخذ میں مجھے اس بحث میں سیدنا عمر کے اس قول کا کوئی حوالہ دکھائی نہیں دیا۔ (البتہ برادرم مولانا عبد الجبار سلفی نے بتایا ہے کہ جناب علامہ خالد محمود نے اپنے کسی پرانے مضمون میں اس کا ذکر کیا ہے۔) یقیناً یہ ایک مسئلہ اجتہادی ہے اور کوئی واضح اور صریح نص نہ ہونے کی وجہ سے اس میں فقہا کے مابین اختلاف بھی واقع ہوا ہے، تاہم سیدنا عمر کا یہ قول ہمارے خیال میں ترجیحی دلائل میں ایک اہم دلیل کی حیثیت رکھتا ہے۔

ماعز بن مالک یا مالک بن ماعز ثقفی کا بیان ہے کہ میرے والد اپنی اور اپنی اہلیہ اور بیٹی کی طرف سے قربانی کرنے کے لیے دو جانور ساتھ لے کر گئے جو ذی الجاز میں ان سے گم ہو گئے۔ جب یوم النحر آیا تو انھوں نے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کو یہ بات بتائی۔ سیدنا عمر نے فرمایا کہ:

تربص اليوم وغدا وبعد غد فانما النحر فی هذه الثلاثة الايام (مصنف ابن ابی شیبہ، ۱۴۶۵۶)

''آج کا دن اور کل اور پرسوں کا دن انتظار کرو، کیونکہ قربانی انھی تین دنوں میں کی جاتی ہے۔''

خطبہ حجۃ الوداع: اسلامی تعلیمات کا عالمی منشور

تدوین وتخریج متن: محمد عمار خان ناصر

توضیحی محاضرات: مولانا زاہد الراشدی

[صفحات: ۱۴۴۔ قیمت: ۱۰۰ روپے]

ناشر: الشریعہ اکادمی، گوجرانوالہ

ڈاکٹر ابراہیم موسیٰ*

ترجمہ: وارث مظہری**

ہندوستان کی روایتی اسلامی فکر میں تاریخ اور قانونی معیاریت

(قاری محمد طیب کے افکار کی روشنی میں اسلامی شریعت کا مطالعہ-۲)

اجتہاد کی تشریحات:

قاری طیب صاحب کی اجتہاد کی مجموعی تشریح میں تین متلازم عناصر ہیں: تقویٰ، علمیات اور تاریخ۔ ان تینوں زاویوں کو نظر انداز کرنے سے ان کے تصور اجتہاد کی غلط تفہیم اور ساتھ ہی ان چیزوں کے ان کے تصور کی تحریف ہوسکتی ہے۔ زمانۂ حال کے آزاد خیال تصور اجتہاد اور اخلاقیات کی تشریح وتعبیر میں مشکل ہی سے ایسی قواعد سازی یا قواعد کی تلاش کا سراغ ملے گا، جس کو تقویٰ اور فقیہ وعالم کے شخصی اخلاق کا پابند بنایا گیا ہو۔ اس کے برعکس قاری صاحب نہ صرف اس زاویہ کو خاصی اہمیت دیتے ہیں بلکہ مذہبیات کی تعبیر کی اپنی گفتگو میں وہ اسے مرکزی مقام دیتے ہیں۔

آگے وہ اپنی گفتگو میں عالم تکوین میں نئی ایجادات وممکنات کی تلاش کو بھی مرکزی خیال بناتے ہیں جو کتابِ فطرت ہے اور عالم تشریع بھی جو کہ کتابِ الٰہی ہے، اُسی کے مماثل ہے۔ پھر اس مثلث کے تیسری ترکیبی جز پر یوں گفتگو کی گئی ہے کہ کیسے ہر انسانی قلب و روح پر الٰہی نقوش ظہور پذیر ہوتے ہیں جنہیں صوفیا لوحِ قلب سے موسوم کرتے ہیں۔(۳۸)

تقویٰ:

قاری طیب صاحب بتاتے ہیں کہ وحی خدا کے فرستادوں کے لیے شخصی اوصاف کو شامل ہے اور اخلاقیات کا بڑا حصہ بقیہ انسانیت کو ان کے شخصی اوصاف سے ہی ملتا ہے۔ اپنے مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے پیغمبروں نے خارجی وسائل سے تبھی کام لیا ہے جب داخلی طور پر ان کی شخصیتیں کامل اور پاکیزہ ہوگئیں اور روحانی طور پر بلند پیغمبروں کو واضح فائدے بھی ملے، کیونکہ لوگوں کو ان میں رشد وہدایت کے رول ماڈل مل گئے۔ چونکہ خدا کے رسولوں کو روحانی

* فاضل دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ۔ ایسوسی ایٹ پروفیسر، اسلامک اسٹڈیز، ڈپارٹمنٹ آف ریلی جن، ڈیوک یونی ورسٹی، نارتھ کیرولینا، امریکہ۔ ای میل: moosa@duke.edu

** ایڈیٹر ماہنامہ ''ترجمان دارالعلوم''، دہلی۔ ای میل: w.mazhari@gmail.com

اور اخلاقی کاملیت کا وہ درجہ ملا تھا جو عام لوگوں سے بہت ارفع تھا، لہٰذا انہیں اپنے پیروکاروں کے لیے اخلاقی تعلیمات کا مفہوم بتانا آسان ہو گیا۔ (۳۹)

دوسری طرف ان سے کم درجہ کے لوگ مثلاً علماء کو سب سے پہلے اخلاقی اور قانونی نظام کے ثانوی ضوابط اس علم کی روشنی میں تلاش کرنے پڑتے ہیں جو انہیں تعلیم و تحقیق کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے اور جب یہ طبقہ روحانی برکات اور تزکیۂ نفس و تصفیۂ قلب کے اعتبار سے ارتقاء کرتا ہے جیسے یہ تمام داخلی احوال جو احتسابِ نفس اور مراقبہ وغیرہ کی سخت محنت کے بعد حاصل ہوتے ہیں، وہ بھی بتدریج اخلاقی تعلیمات میں پنہاں اخلاقی اسباب اور تکوینی اسباب کے ابعاد دریافت کرنے لگتے ہیں۔ اس قسم کی روحانی تیاری ایسے علماء کو قیاسی ضابطے وضع کرنے اور اشباہ و نظائر کے صحیح اطلاق کے قابل بنا دیتی ہے۔ انہیں اخلاص کا وہ درجہ ملتا ہے جس سے وہ اجتہاد کے اصول و ضوابط تلاش کرنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔ ایمان و یقین اور علم و عمل سے نہ صرف ان کی ثقاہت بڑھتی ہے بلکہ رحمت خداوندی بھی ان پر مہربان ہوتی ہے۔ (۴۰) یہاں قاری طیب صاحب اپنی تائید میں ایک حدیث بھی پیش کرتے ہیں کہ: من عمل بماعلم و رثه الله علم ما لم یعلم' جس نے اپنے علم پر عمل کیا تو اللہ تعالیٰ اسے ایک ایسے علم کا وارث بناتا ہے جو اب تک اس کے پاس نہ تھا۔ (۴۱)

متصوفانہ فقہی خطاب میں اخلاقی تشکیل کے لیے ایک لفظ جو اکثر استعمال ہوتا ہے وہ ذوق ہے جس کا لفظی مفہوم مزہ یا taste ہے، لیکن اصطلاحاً اس کا مفہوم ہے روحانی بصیرت اور الوہی اشیا کا علم۔ اس میں یہ فرض کیا جاتا ہے کہ انسان کو اخلاقی و روحانی تربیت سے گزرنا ضروری ہے تاکہ وہ اخلاقی احساس کے تئیں ایک جمالیاتی حس کو ارتقا دے سکے جس کے ذریعے اسے باطنی معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ یہ صلاحیت حاصل کر کے اب ایک فقیہ مزید علم حاصل کرتا ہے جس سے وہ ظاہری علم میں مطابقت دے سکے اور شریعت کے مجموعی مقصد یعنی سلامتی کے حصول کو پورا کرے۔

فقہاے مجتہدین جنھیں تقویٰ و پرہیزگاری کی یہ صفت ملی تھی اور انھوں نے قاری صاحب کے الفاظ میں، اس صلاحیت کو بہت بڑھا لیا تھا، انھیں اجازت تھی کہ وہ خود کو عطا کردہ علم لدنی کو کام میں لائیں۔ استدلال و قیاس کرتے وقت وہ فقہی حذر و احتیاط برتتے ہوئے اپنی اسی صلاحیت و موہبت کو کام میں لاتے تھے۔ شروع میں اس نظریہ کو پیش کرنے میں قاری صاحب بہت محتاط اسی وجہ سے تھے کہ اس سے وہ لوگ دور ہو جائیں گے جو ان کے متصوفانہ خیال سے اتفاق نہیں رکھتے، پھر بھی قاری طیب صاحب متصوفانہ تقویٰ اور شرع کی اخلاقی ہدایات میں تطبیق دینے کی طرف بہت زیادہ مائل ہیں۔

متقی و پرہیزگار عالم کے اپنے قدسی علم کو استعمال کرنے کے پہلو کو واضح کرنے کے لیے وہ فقہ کے حنفی مکتبِ فکر کی طرف توجہ دلاتے ہیں جس کو عقلیت اور رائے کی طرف زیادہ مائل کہا جاتا رہا ہے۔ اس خیال سے اختلاف کرتے ہوئے انھوں نے اس پر نرم و شائستہ تنقیدیں کی ہیں۔ انھوں نے ناراضگی کے ساتھ کہا کہ محض وہ لوگ جو اخلاقیات کی پیچیدگیوں کو نہیں سمجھتے، وہی عالمانہ نظریات کو ''صرف مشابہت'' قرار دینے کی جرأت کرتے ہیں یا ان کے پیروؤں کو ''صاحب الرائے'' کہنے کی جسارت کر سکتے ہیں۔ حنفی مکتبِ فکر کے ناقدوں کی طرف سے یہ لفاظی اس لیے کی گئی کہ اس کے پیروکاروں کو یہ الزام دیا جا سکے کہ وہ اصل شرعی مصادر سے کم اور عقلی رجحانات سے زیادہ دلچسپی رکھتے ہیں۔

قاری صاحب شکایت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ جو لوگ ایسی غلط تنقیدیں کرتے ہیں، وہ یہ سمجھنے میں ناکام رہے ہیں کہ حقیقی فقیہ وہی ہوسکتا ہے جو عقلیت اور روحانیت دونوں کا امتزاج رکھتا ہو۔ یہ کہتے ہوئے واضح طور پر قاری صاحب کے ذہن میں سلفی مکتبِ فکر رہا ہے۔ انہوں نے بغیر کسی معذرت کے یوں اظہار خیال کیا ہے:

''فقیہ کبھی شاہد سے غائب کی طرف جاتا ہے جب کہ واضح جزئیہ سے اس کی مستور علت نکالتا ہے اور کبھی غائب سے شاہد کی طرف آتا ہے جبکہ کلیہ سے جزئیات کی طرف لوٹتا ہے اور یہ دونوں ایاب وذہاب عوام اور عام علماء کی نگاہوں سے اوجھل ہوتے ہیں۔ اس لیے فقیہ مجتہدان کی نگاہوں میں شریعت میں ذاتی رائے سے متصرف دکھائی دیتا ہے۔ کوئی ناسمجھی سے اسے از راہ طعن قیاس کہتا ہے اور کوئی صاحب الرائے وغیرہ، حالانکہ اس کی یہ رائے اور قیاس محض عقلی نہیں ہوتا اور نہ محض قوت فکریہ کا ثمرہ ہوتا ہے کہ اُسے تصرف ذاتی کہا جائے، بلکہ اس ذوقی قوت کا ثمرہ ہوتا ہے جو شریعت ہی کے علم ومزاولت سے بطور تجربۂ صادق اُس کے قلب میں من اللہ تعالیٰ القاء کی جاتی ہے۔ پس وہ تصرف خود شریعت ہی کا عین شریعت میں ہوتا ہے نہ کہ اس کا۔ مگر ہاں اس کا ظہور اسی کے ذریعہ ہوتا ہے جیسا کہ تمام شرائع سماویہ کا ظہور محض من اللہ ہے، مگر ہوتا ہے نبی کے ہی لسان وقلب پر۔ اور یہ نہ طعن کی چیز ہے نہ حیرت وتعجب کی۔ انبیا کے بعد امت میں محدَث بھی ہوتے ہیں جن کی خبر دی گئی، انبیاء کو لسان شریعت میں متکلم فرمایا گیا ہے اور غیر انبیا کو جو ان کشوف الٰہی اور علومِ تشریعی تک الہام کے ذریعہ پہنچائے جائیں اصطلاح شریعت میں محدَث کہا گیا ہے۔'' (۴۲)

شریعت کے اس صوفیانہ اور متقیانہ تصور میں قاری صاحب علم کو الوہی اشراق سے وابستہ کر کے اسے بھی وحی کا حصہ بنا دیتے ہیں۔ اگر کسی موقع پر متن کے ظاہری معنی میں علم لدنی تبدیلی کر دے تو قاری صاحب واضح طور پر اسے جواز دینے کا رجحان رکھتے ہیں۔ انہوں نے ایک حدیث بیان کی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ قرآن سات حرفوں (سبعة احرف) پر نازل ہوا ہے اور ہر آیت کا ایک ظاہری معنی (ظهر) اور ایک باطنی معنی (بطن) ہے۔ اور ہر حد کے لیے ''مطلع'' (جداگانہ طریقۂ اطلاع) ہے یعنی وہ متصوفانہ اور روحانی پہلو رکھتا ہے۔ (۴۳)

یہاں تفسیری نکتہ ایک حقیقی منظر نامہ میں بدل جاتا ہے جہاں سے ہر چیز کا مشاہدہ وضوح اور احساس کے ساتھ کیا جا سکتا ہے۔ (۴۴) یہ بھی نوٹ کیا جانا چاہیے کہ فہم کی ایک مخصوص صفت بھی مجتہد کے ساتھ جڑی ہوئی ہے جو قاری طیب صاحب نے اس موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے لکھی ہے۔ فہم واستدلال کے ساتھ ہی ایک طرح الہام بھی مجتہد کے لیے ضروری ہے۔ جس کو الہامی بصیرت ہو، اُسے محدَث کہتے ہیں جسے فطرت نے اخلاق اور انسانیت کے لیے تسکین بخش تعلیم سے نوازا ہے۔ (۴۵)

مجتہد کے روحانیت اور مخصوص الہامی بصیرت سے متصف ہونے کا تصور صرف دیوبندی مکتب فکر کے ساتھ خاص نہیں، اگرچہ ان کے ہاں اس تصور کی زیادہ وضاحت ملتی ہے۔ چوتھی صدی ہجری کے فقیہ تقی الدین ابن تیمیہ نے بھی فہم وشعور کی تعریف کرتے ہوئے اسے روحانیت سے مربوط کیا ہے۔ (۴۶) روحانیت ایک تابناک چراغ ہے۔ شب تاریک میں ایک قندیل رہبانی ہے اور جس میں جتنی طاقت ور روشنی ہوگی اتنی ہی اس سے ماحول میں روشنی پھیلے گی۔

اسی طرح جن مومنین کو قلبی روشنی [الالھام القلبی] حاصل ہوتا ہے، وہ رہنما اصول نہ ملنے کی صورت میں بھی اپنے وجدان سے طے کر سکتے ہیں کہ سچائی کے ساتھ کیا چیز مطابقت رکھتی ہے جو قرآن کے مطابق بھی ہو؟

یہ وجدانی پیش قیاسی غلط اور باطل چیز کو رد کرنے کے سلسلے میں متنی بیانات (یعنی القول، العلم اور الظن) کے استناد کے متوازی ہے جنہیں ایک فقیہ اپنے کام میں استعمال کرتا ہے۔ پھر ابن تیمیہ محدث کی حیثیت رکھنے والے لوگوں کے فضائل بیان کرنے والی حدیثیں بیان کرتے ہیں۔ مثلاً حضرت عمرؓ بھی اُنہیں میں سے ایک ہیں۔ محدث کی تعریف یہ کی جاتی ہے کہ وہ **الملھم المخاطب فی سرہ** ہے (۴۷) یعنی ایسا شخص جس پر خدا کی طرف سے الہام ہو۔ خدا اس سے خطاب کرے۔

علمیات:

قاری طیب صاحب ایک طرف تو مجتہد کی داخلی کاملیت اور تقویٰ کے مابین، دوسری جانب علمیاتی اور استدلالی علوم کے مابین ایک واضح رابطہ دیکھتے ہیں۔ فی الحقیقت انھوں نے فقیہ کی روحانی معرفت اور روایتی و قیاسی علوم میں ایک جدلیاتی رشتہ استوار کرنے کی تجویز دی ہے۔ جس شخص کو بھی قیاس و استدلال سے دلچسپی ہو، اسے سب سے پہلے ''روایت'' اور دینی علوم حاصل کرنے چاہئیں۔ دوسرے وہ درایت کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتا۔ (۴۸)

علوم آلیہ، مثلاً احادیث و آثار کی توثیق، متن کا استناد اور مختلف زمانوں میں ان کی روایت کے طریقے اور آخر میں ان کی تعبیر و تشریح، سب کے سب قاری صاحب کے نظریہ میں، ایک بڑی خدائی اسکیم کا حصہ ہیں۔ اگر وہ شخص جو تعلیم و تعلم اور روایت و تفسیر کے طریق کار سے وابستہ ہے، بزرگانہ فضائل سے محروم ہو تو یقینی طور پر وہ وحی کی ثقاہت کو مجروح کرے گا۔ شخصی تقویٰ ثقاہت کا اشاریہ ہے اور معلومات کے مصادر کی کمی کو پورا کرتا ہے جو عمق اور وسعت اجتہاد کے لیے ضروری ہے۔ وہ کئی چیزوں سے متعلق ہے۔ مثلاً مجتہد وحی کی تعبیر و تشریح میں اہم رول ادا کرتا ہے، پھر کتاب و سنت کی تعلیم کو احتیاط کے ساتھ قوم کو دیتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں جو کام فقیہ کو کرنا ہے، وہ اسے تقدس و اعتبار بخشتا ہے۔ اس طرح فقیہ کے کاندھے پر جو ذمہ داری ہے، اسی لحاظ سے اس روایت کو آگے بڑھانے اور منتقل کرنے کے باعث اسے زبردست استناد بھی حاصل ہوتا ہے۔

تاریخ:

قاری صاحب مجتہد کے کام کو ایک بڑے تاریخی فریم میں رکھتے ہیں۔ وہ مختلف حالات کو سمجھنے کے لیے انسانی اختلاف کو تسلیم کرتے ہیں۔ ہاں اس میں فرق مراتب ہو سکتا ہے۔ پھر بھی ان کا احساس ہے کہ یہ ضروری نہیں کہ جو زیادہ ذہین و فطین معلم ہو وہ بڑا مجتہد بھی ہو:

> ''یہ امر بھی مخفی نہ رہنا چاہیے کہ اس تفاوت افہام کے سلسلہ میں ذہانت و نطانت کا ہر درجہ معتبر نہیں یعنی ہر فہیم مجتہد یا فقیہ نہیں کہلایا جائے گا بلکہ اس بارے میں فہم کا صرف وہی درجہ معتبر ہوگا جو معتد بہ ہو اور محض موہبت ربانی ہو، جو بطور علم لدنی قلبِ مجتہد میں القاء کیا گیا ہو۔ یعنی جس طرح کائنات خلق کے سلسلہ میں نہ

ہر چھوٹے بڑے فہم کا آدمی موجد ہوسکتا ہے، باوجود یکہ ہر دور میں موجدوں کی بھرمار ہوتی ہے، بلکہ حق تعالیٰ کی حکمت جب کبھی تمدن کے کسی خاص پہلو میں ترقی دیکھنا پسند کرتی ہے تو قرنوں اور زمانوں میں چند مخصوص دماغ منتخب کر کے ان سے ایجاد کا کام لیتی ہے اور وہ تمدن کے ان گوشوں کو آراستہ کر دیتے ہیں جن کی زیبائش کی ضرورت تھی۔'' (۴۹)

قاری صاحب اپنے قاری کے ذہن میں اس بارے میں کوئی شک وشبہ نہیں چھوڑتے کہ وہ تاریخ کے فہم کا ایک خاص ادراک رکھتے ہیں۔ اس نکتہ کو مؤکد کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں:

''نہ ہر فہیم وذہین مجتہد ہوسکتا ہے نہ ہر دور میں مجتہد پیدا ہوتے ہیں بلکہ حکمت ربانی تدین کے کسی مخفی گوشے کو نمایاں کرنا چاہتی ہے تو خاص خاص ذہنیت کے افراد پیدا کر کے ان کے قلوب میں ذوق اجتہاد ڈالتی ہے اور وہ اپنے اس خاص وہبی ذوق سے تدین کے ان پہلوؤں کو واضح اور صاف کر کے اور گویا بال کی کھال نکال کر امت کے سامنے پیش کر دیتے ہیں جن کے اظہار کی ضرورت ہوتی ہے۔'' (۵۰)

قاری صاحب کی تشریح دو محسوس اثر ڈالتی ہے۔ سب سے پہلے تو وہ یہ مان کر چلتے ہیں کہ انسانی امور میں غیب کا غیر محسوس ہاتھ کام کر رہا ہے اور مخصوص وقتوں میں یہ ہاتھ مخصوص صلاحیتیں، رجحانات اور ضرورتیں وضع کرتا ہے۔ یعنی ان کے خیال میں ایک خاص سماجی ارتقا کام کر رہا ہے۔ آدم اسمتھ کی غیر فطری بازگشت سے الگ، اس غیبی ہاتھ نے زندگی کے ہر مرحلہ میں مفاد عام کی چیزوں کو منضبط کیا ہے اور ضروری چیزیں فراہم کی ہیں۔ (۵۱)

دوسرے پہلو میں قاری صاحب تاریخ کی تقسیم کی اہمیت کو ظاہر کرتے ہیں۔ مسلم علما کی ہر نسل نے روایت کی تنقیح و توضیح میں مخصوص کردار ادا کیا۔ ان کے تصور کے مطابق ہر زمانہ کے لوگ مخصوص صلاحیت، مخصوص اوصاف اور کردار کے حامل ہوتے ہیں اور وہی غیبی ہاتھ ہر زمانہ میں ان کی دست گیری کرتا ہے۔ اسی وجہ سے محنت کی تقسیم مفاد عامہ اور زندگی کی ضرورتیں مادی ہوا کرتی ہیں۔

قاری طیب صاحب کے یہاں اسلام کے قانون اور اخلاقیات کی تشریح میں مادیت مرکزی مقام رکھتی ہے۔ وقت کا ایک خاص تصور ان کے فلسفۂ تاریخ کی بنیاد ہے۔ دوسرے الفاظ میں ان کا اصرار ہے کہ مختلف تاریخی زمانوں میں بنیادی عقلی اختلافات ہوتے ہیں اور ہر مخصوص زمانہ کے مخصوص اوصاف ہوتے ہیں۔ گویا وہ ہر زمانہ کو اس کا خاص ''ڈی این اے'' دیتے ہیں۔ اپنے وضع کردہ منظر نامے میں انھوں نے یہ فرض کیا ہے کہ ہر مخصوص قوم کو مخصوص زمانوں میں خاص احوال، امکانات اور صلاحیتیں عطا ہوتی ہیں جن سے وہ اپنے مختلف کام انجام دیتی ہے۔ کچھ وقتوں کے بعد، جس کی انھوں نے کوئی تحدید نہیں کی، یہ صلاحیتیں معدوم ہو جاتی ہیں اور اس کے زمانہ کے حسبِ حال اور صلاحیتیں اور توانائیاں عطا کر دی جاتی ہیں۔

مثال کے طور پر وہ یہ مانتے ہیں کہ شریعت کی روایت میں گزشتہ نسلوں نے کافی محنت کر دی ہے۔ خطابیات میں زبردست یادداشت کو بہتر طریقہ پر استعمال کر لیا گیا جس سے عرب کے نوزائیدہ معاشرے کی سرگرمیوں کا ریکارڈ بعد والوں کے لیے محفوظ ہو گیا۔ اگر اس زمانہ میں غیر معمولی یادداشت نہ ہوتی تو بہت ممکن تھا کہ اسلام کے بنیادی مصادر کا

آزادانہ مطالعہ نہ کیا جا سکے، لیکن خدا کا کرنا تھا کہ کئی نسلوں تک یہ صلاحیتیں زبردست انداز میں رہیں، جن میں بعد میں انحطاط آیا، اس قسم کی ممتاز صفات تاریخ کے ایک خاص زمانہ تک ہی اپنی معنویت برقرار رکھتی ہیں۔

ارتقا کی اصطلاح کو استعمال کیے بغیر ہی قاری محمد طیب جو کچھ کہنا چاہتے ہیں بہت وضاحت کے ساتھ کہتے ہیں کہ جب مخصوص صلاحیتیں مطلوب نہیں ہوتیں تو وہ سماجی ارتقا کے ساتھ ہی عموماً غائب ہو جاتی ہیں۔ اسی طرح کا پیٹرن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے نقل وروایت اور تدوین میں دیکھا جا سکتا ہے۔ تاریخی طور پر حدیث مصدقہ نقل وروایت اور ان کے بے شمار ثقہ راویوں کے سلسلہ کو کہتے ہیں۔ قاری صاحب کے خیال میں یہ علمی عمارت پہلے ہی مکمل ہو چکی ہے۔ موجودہ زمانہ میں نقل وروایت کی نقد وتنقیح کی ضرورت بہت کم رہ گئی ہے؟ اس لیے کہ اس طرح کے کام کے لیے جو صلاحیت اور رجحان درکار ہے وہ اب نہیں پایا جاتا۔

اسی طرح شریعت کے وسیع خطوطِ کار کی درایت کا کام بھی ماقبل کی نسلیں انجام دے چکی ہیں۔ اس لیے بغیر حقیقی ضرورت اور وجہ جواز کے ان کاموں کو از سر نو کرنا ایک فضول کام ہوگا۔ حقیقت میں قاری صاحب اس سلسلہ میں ایک فطری دلیل پیش کرتے ہیں کہ انسان اب ارتقا پذیر ہو چکا ہے اور عقیدہ کے اصیل بیانات کے فہم کی صلاحیتوں کا اظہار نہیں کرتا۔ مثال کے طور پر ابتدائی زمانہ کے مجتہدین نے فقہی واخلاقی نظام کے کلیات وضع کیے اور ان سے بے شمار حقائق حیات اور جزئیات نکالے۔ ممکن ہے ان کی اس بات پر زیادہ اطمینان نہ کیا جا سکے کہ اب اس طرح کے بڑے کام کی صلاحیت ہم میں نہیں ہے۔ انہوں نے مجرد مادی صلاحیتوں پر زور دیا اس میں یہ شک بڑھ جاتا ہے کہ گویا ڈائناسورس کی مانند مخصوص قسم کے کام اور صلاحیتیں اب ہم سے ''نیست ونابود'' ہو چکی ہیں۔

حیرت کی بات یہ ہے کہ قاری محمد طیب کے خیال میں نظریات، اعمال اور ضوابط پر اسی طرح غور وفکر کے ذریعہ جیسے قرون اول کے علما نے کیا، اجتہاد کرنا بھی ایک بے کار کا عمل ہے۔ شروع کے مجتہدین نے پوری ذہانت کے ساتھ اصول وشرائع کی تفسیر وتشریح کا یہ کام انجام دے دیا ہے۔ ان کے خیال میں اس طرح کا کام پھر کرنے کا مطلب ہے ایک بے کار کام میں لگنا۔ وہ کہتے ہیں کہ یہی فطری اصول ہے کہ جب ایک ہدف حاصل ہو جاتا ہے تو اس ہدف تک پہنچنے کے لیے ضروری توانائی بھی ختم ہو جاتی ہے۔ (۵۲) حیرت کا مقام ہے کہ قاری طیب صاحب آج کے معلومات کے زمانہ کے بارے میں کیا کہتے جب سائنٹفک ایجادات وترقیات نے نئے امکانات اور نئے مواقع کھول دیے ہیں جنہوں نے ماضی کے تمام تصورات کو بدل کر رکھ دیا ہے۔ کیا اس انفارمیشن کے زمانہ کا اسلامی فکر کے ارتقا میں کوئی حصہ نہیں ہوگا؟ بنیادی طور پر ایک بالکل مختلف انداز میں کلاسیکل مسلم علما کے تصور سے جدا ہوگا؟

اگر قاری طیب صاحب کے خیالات کا تقابل انیسویں صدی کے تصورِ تاریخ سے کیا جائے جس میں ماضی کے تمام قدیم دینیاتی، مابعد الطبعیاتی اور نظریاتی تصورات سے آزاد ہو کر ماضی کے مطالعہ کی خواہش پائی جاتی ہے تو ان کے خیالات کو بمشکل ہی اس تناظر میں دیکھا جا سکتا ہے۔ اگرچہ ماضی کی نظریاتی فضا سے آزاد ہو کر اس کا مطالعہ توقع سے زیادہ چیلنج سے پُر ثابت ہوا۔ نظریہ کی تفہیم یوں کی گئی کہ وہ مخصوص ایمانیات اور ماضی کے معلومات کا ایک سیٹ ہے۔ طیب صاحب کی تھیوری نظریاتی پابندیوں سے آزاد نہ تھی، تاہم اس بارے میں وہ کوئی الگ تھیوری نہ تھی۔ تاریخی

مطالعات بھی، جیسے کہ ہائڈن وائٹ نے اشارہ کیا ہے، ایک پیچیدہ عقدہ کا شکار ہیں۔ (۵۳) ایک علم کے بطور تاریخ کو بھی ایک تھیوری کی ضرورت تھی۔ لیکن نظریہ میں دلچسپی لینے کا مطلب ہے کہ غیر دلچسپ معلومات کے انبار کو بند کر دینا۔ اس مشکل کا حل ہسٹاریکل حقیقت کا تاریخی تناظر ہے۔ اس خیال نے تاریخیت کو دنیا میں وجود کے سماجی تشکل کی صورت دے دی ہے۔ تاریخیت نے دنیا میں ایک مخصوص سماجی تشکل کو بڑھایا ہے جس میں مادی تجربات کی کارفرمائی ہے، مگر یہ تصور قاری طیب صاحب کے تصور سے یکسر مختلف ہے۔

رین ہارٹ کوسیلیک (Reinhart Koselleck) کے کام کی بنیاد پر ہائڈن وہائٹ تاریخی وقت اور فطری وقت کے مابین ایک نقطۂ امتیاز کھینچنے میں کامیاب ہوئے۔ اس طرح وہائٹ کے نزدیک: تاریخ کے معنی کی تشریح ایک معاشرتی حقیقت کے بطور کی جاسکتی ہے جو تغیر پذیر ہے، لیکن اس طریقہ پر نہیں جس سے فطرت گزری ہے۔ (۵۳) اس کے اختلاف، تعدد معیار اور اجتہاد کے تباین الوان کے ذریعہ، اسی تعدد کے ساتھ وقت کی تاریخ وقت کی فطرت سے مختلف ہے۔ لوگ یہ بھی مانتے ہیں کہ تاریخی، زمان انسانی عمل کے ذریعہ اور مقصدیت کے باعث متاثر ہوسکتا ہے، فطری زمان نہیں ہوسکتا۔ تاریخ بنائی اور بگاڑی جاسکتی ہے، اور یہ کہ تاریخی علم تصور کے مطابق ہوتا ہے بشرطیکہ سماجیات کے تصورات تجربات کو معتدل کریں اور مستقبل میں امید اور یقین کو جگائیں۔ (۵۵)

قاری صاحب کے اخلاقی فلسفہ میں مادیت کو جو مرکزیت حاصل ہے اس کو سمجھنے میں وائٹ کے خیالات سے مجھے کافی روشنی ملی، کیونکہ اگر قاری صاحب صاحب تاریخی زمان پر اتنا زیادہ زور دیتے ہیں تو اس لیے کہ انھوں نے مادیت کی جینیٹکس کو اسلام کی اخلاقی اور فقہی تاریخ میں مرتب کیا ہے۔ قاری طیب کے نظریہ میں افتراضی میلانات، احساسات سے لے کر روحانی توجیہات تک سب مختلف زمانوں میں بڑے پیمانہ پر مختلف ہوتے ہیں۔ اگر یہ ماننے یا کہنے کی کوئی معقول وجہ نہیں ہے کہ قاری صاحب جان گوٹ فرائڈ وان ہرڈر (Johann Gottfried Von Herder) کے خیالات سے آگاہ تھے، تاہم پراسرار طور پر اٹھارہویں صدی کے اس جرمن مفکر اور بیسویں صدی کے ہندوستانی عالم کے مابین کسی قدر ہم آہنگی موجود ہے جس کی ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ دونوں حضرات روایت کو اہمیت دیتے ہیں۔ ''ہرڈر'' کا ایک اقتباس بھی اسی سے ہم آہنگ ہے۔ کانٹ (Kant) کے بارے میں لکھتے ہوئے ہرڈر نے لکھا ہے:

> ''حقیقت میں جو چیز بھی تغیر پذیر ہو وہ اپنے زمانہ میں اپنا ایک پیمانہ رکھتی ہے جو جاری رہتا ہے۔ دو دنیاوی چیزیں ایک زمانہ میں ایک ہی پیمانہ نہیں رکھ سکتیں..... لہٰذا [جرأت سے کہا جاسکتا ہے] کہ کائنات میں ایک مخصوص زمان میں بے شمار متعدد زمانے ہوسکتے ہیں۔'' (۵۶)

جبکہ ہرڈر کا مطلب زمان کے تعددی اور جزوی فطرت کا بیان تھا، پھر بھی اس نے ہر تغیر پذیر اشیا کو زمان سے جوڑ دیا ہے۔ ٹھیک اسی طرح قاری صاحب بھی کرتے ہیں کہ ان کے خیال میں بھی دو لمحے اور دو چیزیں بھی برابر اور یکساں نہیں ہوتیں۔ ہر ایک ممتاز ہوتی ہے۔ مادیت کا یہی تصور ہندوستانی فلسفی شاعر محمد اقبال نے بھی بیان کیا ہے۔

اپنے اس بیان کے دوران قاری محمد طیب نے تقریباً بے شعوری میں یہ بھی بتا دیا ہے کہ ایک مسلمہ روایت کیسے کام

کرتی ہے۔ روایات فی الواقع بنیاد پرستی پر مبنی تنقید اور اعادہ کا شکار ہو سکتی ہیں اور اس اعادہ کو روکا نہ جائے تو اس روایت کے معماروں نے جو بنیادی کام کیا ہے، وہ متاثر ہو سکتا ہے۔ اگر ایسا ہے اور اگر بنیادوں کو ہی متاثر ہونے دیا جائے تو یقیناً اس روایت کے استحکام کو نقصان پہنچے گا۔ قاری صاحب جدید مسلم مفکروں سے ناراضگی ظاہر کرتے اور اپنے مذکورہ خدشہ کا اظہار کرتے ہیں جو اجتہاد کے دروازہ کو عقلی آزادی اور اسلام کی تشریحِ نو کے لیے کھولنا چاہتے ہیں۔ وہ ان کا خاکہ اڑاتے ہوئے ایک وارننگ بھی دیتے ہیں کہ اجتہاد میں مصروف ہونے کا مطلب ہے کہ ماضی کے علما کے فکری ورثہ کو تباہ کرنا۔ اور اس سے بھی زیادہ خراب یہ کہ مسلمات کو برباد اور اسلام کی محرف شکل سامنے لانا ہے۔

ان کی شدید اخلاقی وابستگی کے ساتھ، ان سے اتفاق کیے بغیر، یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ کیوں قاری صاحب اپنے تصورِ روایت کو مخصوص وحدتوں میں فطرت سے ہم آہنگ (Naturalize) کرتے اور اسے مخصوص خصائص سے متصف قرار دیتے ہیں۔ فطری مادیت کو بیان کرنے کے بعد انہوں نے بعینہ وہی پیمانہ تاریخی مادیت کے لیے استعمال کیا ہے۔ زمانہ کی خصوصیت اور جو چیزیں اس میں پیش کی گئیں، ان سے قاری صاحب فقہاے مجتہدین کو ایک استثنائی رنگ میں پیش کرتے ہیں، کیونکہ ان کا زمانہ بے نظیر تھا جو غیب سے ظہور میں آیا، اور اس طرح کے حالات پھر کبھی پیش نہیں آئے۔ یہاں وہ اس ''فطری غلطی'' میں پڑ جاتے ہیں کہ وہ ''کیا ہے'' سے ''کیا ہونا چاہیے'' کو اخذ کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ چیزوں کو جس طرح انسان سمجھتا ہے، ویسے ہی انہیں ہونا چاہیے۔ اس غلطی پر تعجب اس لیے نہیں کہ انہوں نے فطری زمان اور تاریخی زمان میں کوئی فرق نہیں کیا، دونوں کو یکساں قرار دے دیا۔ ان کے غور وفکر کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ کچھ ذہنی کاوشیں اور سوالات ایسے ہوتے ہیں جن پر توجہ نہیں دی جانی چاہیے۔

اس طرح کے اجتہاد کی اگر ماضی میں کچھ نظیریں ملتی ہیں تو اب ان کو دہرایا جانا نہیں چاہیے۔ ایسا کیوں؟ ان نظائر کا اعادہ کیوں نہیں ہو سکتا؟ اس کا کوئی اطمینان بخش جواب قاری طیب کے پاس نہیں ہے۔ یہ بھی نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ ان کی تشریح علما کے مفادات کا تحفظ کرتی ہے، جن کا کردار، اس صورت میں روایت کے شارحین کے بطور ناگزیر ہو جائے گا، یا یہ نہ بھی ہو تو کم از کم یہ کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے اس بات کی کوشش کی کہ مدون فقہ کو جارحانہ اور بنیاد دووں کو ہلا ڈالنے والے سوالات سے بچایا جا سکے۔

قاری محمد طیب صاحبؒ نے اجتہاد کی صرف اس شکل کو روا رکھا ہے جسے وہ ''قرآن وسنت کے اسرار ومصالح کی جستجو اور دقائق کی تلاش'' سے تعبیر کرتے ہیں (۵۷)۔ اس ضمن میں اجتہاد کا مطلب ہوگا ایسے ضوابط تشکیل دینا جن کے ذریعہ ہر زمانہ میں احکامات کا ایک معیار متعین کیا جا سکے اور مناسب اخلاقی اور قانونی فتوے دیے جا سکیں۔ اجتہاد کی دوسری قسم جس کی وہ اجازت دیتے ہیں، وہ ہے اسلام پر ہو رہے حملوں کا جواب دینا۔ مدافعینِ اسلام کو نصوصِ شرع سے رہنمائی حاصل کرنی چاہیے جن میں قرآن وسنت کے ساتھ میں قدما کے اجتہادات بھی شامل ہیں، خاص طور پر وہ جنھیں مسلمہ روایت کی حیثیت حاصل ہوگئی ہے۔ یہاں انفرادی اجتہاد کو بڑھانے کے مقصد سے قاری محمد طیب دینیات میں جدت اور توافق کو بنظر استحسان دیکھتے ہیں اور اس طرح نئے جدت پسند اہم مسلم مفکرین مثلاً شبلی نعمانی اور محمد اقبال کے موقف کے وہ بہت قریب قریب پہنچ گئے ہیں۔ (۵۸)

خلاصہ:

قاری طیب صاحب مختلف علم کے ذریعہ مسلم معاشرہ کے اخلاقی دائرۂ عمل میں غیب کا ہاتھ کام کرتے دیکھتے ہیں۔ یوں تو ان کے بیانات میں ہر ڈر سے کئی مشابہتیں پائی جاتی ہیں پھر بھی یہ کہے بغیر نہیں رہا جا سکتا کہ ان کا بیان بھی معذرت خواہانہ ہے۔ قاری صاحب کے تصور میں مرکزی جگہ تاریخ کی ہے اور اس خیال کو قبول کیے بغیر ان کے تصورات کو قبول نہیں کیا جا سکتا۔ انہوں نے فطری زمان کو تاریخی زمان کے مترادف سمجھا ہے۔ ان کے نزدیک تاریخ زمان میں واقع ہوتی ہے اور فطری زمان اور تاریخی زمان بالکل ایک ہی چیز ہے۔ انھوں نے دونوں کو مخلوط کر دیا۔ انھوں نے جو یہ خیال ظاہر کیا کہ تاریخ زمانہ کے ذریعہ ہی وقوع پذیر ہوتی ہے۔ یہ بات خود ایک جدید تصور ہے۔ دیکھنے کی بات یہ ہے کہ قاری صاحب کے اجتہاد کی تفہیم ان کے اور ان کی نسل کے ساتھ ہی قبر میں چلی جائے گی یا ان کے پیروکار اسے مستقبل میں آگے بڑھانے کا کوئی لائحہ عمل ترتیب دیں گے، کم از کم سو سالوں کے لیے۔

ابن خلدون کے بارے میں لکھتے ہوئے بروس لارنس کہتے ہیں کہ پندرہویں صدی کے شمالی افریقہ کے اسکالر کی مختلف بات اس کی وہ درا کی تھی کہ وہ تصور کی دنیا میں اپنے ماحول سے آگے کی سوچ سکتا تھا اور معاصرین سے دور رہتے بھی ان سے متعلق تھا (۵۹)۔ اس تعبیر میں ''مختلف ہونے'' پر سارا زور ہے۔

قاری صاحب اور ان کے دیوبندی پیروکار ایک مخصوص سماجی تصور کو عزیز رکھتے ہیں جسے میں نے یہاں پیش کرنے کی کوشش کی ہے، مجھے امید ہے کہ اس میں کامیاب ہوا ہوں۔ اور یہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے کہ کس زاویہ سے وہ کچھ سے جدا ہیں، تاہم کچھ معاصرین سے وابستہ بھی ہیں۔ اس سے سوال اٹھتا ہے کہ کیا قاری طیب صاحب اور ان کے پیرو مشرقی ایشیا میں ایک ایسے رجحان کی نمائندگی کرتے ہیں جو اجتہاد و تقلید کی مخلوط روایت پر مبنی ہے؟ اور اس طرح اصلاحِ مذہبی کا یہ رجحان مشرق وسطیٰ میں رائج جدید اصلاحی رجحانات اور طریقۂ کار سے ممتاز ہے؟ یا یہ بھی معذرت خواہانہ روایت پسندانہ دینیات کی ہی ایک قسم ہے جس کی معنویت پر آج سنجیدہ سوالات کھڑے ہو سکتے ہیں؟ میں فیصلہ کرنے میں جلد بازی سے کام لینا نہیں چاہتا۔ کیا ہم اسے ''روایت پسندانہ عجوبہ، سنکی ذہنیت، حسیت کہیں یا ذہانت''۔ لارنس کا ایک بار پھر حوالہ دینا ان کی دلیل کی قوت سے انکار نہ ہوگا۔ (۶۰) لارنس کے خیال میں قاری طیب کی اس روحانیت آمیز روایت پسندی کو نہ صرف جدید مسلم تحریکیں چیلنج کر رہی ہیں بلکہ اسے انٹرنیٹ پر دستیاب عالمی سطح پر موجود مسلم اسکالروں سے بھی چیلنج کا سامنا ہے جو کہ ایک نیا ظاہرہ ہے (۶۱)۔ لارنس لکھتے ہیں کہ: ''انٹرنیٹ اس عہد میں اب اس سے زیادہ وسیع اختیار ہو کر رہ گیا ہے جتنا کہ دو سو سال بلکہ دس سال پہلے تھا'' اور اجتہاد جو صرف پہلے علما کا حق تھا، اب اس پر ''الیکٹرونک اجتہاد'' کا تصرف ہے جو انٹرنیٹ کے ذریعہ ہو رہا ہے، جس میں عورتیں بھی شامل ہیں۔ جہاں آپ کی آواز بطور خاص سنی جا سکتی ہے۔ اس ''ای میل اجتہاد'' کا اثر کیا ہوگا یہ کہنا تو بڑا مشکل ہے تاہم کسی قدر تیقن کے ساتھ یہ پیش قیاسی کی جا سکتی ہے کہ انٹرنیٹ پر جو اجتہاد کیا جا رہا ہے وہ زمانوں سے چلی آ رہی مسلم روایت اور عمل پر ضرور اثر انداز ہوگا بالکل ایسے جیسے جدیدیت پسندوں کے دباؤ سے گزر کر یہ اجتہاد تبدیل ہوا ہے۔ ای میل اجتہاد کے کی حقیقت کے بارے میں، ظاہر ہے

قاری طیب صاحب اپنے وقت میں سوچ بھی نہیں سکتے تھے چہ جائیکہ اس کا مقابلہ کرتے۔

یہ واضح ہے کہ کم از کم اسلامی قدامت پسندی میں استدلالی روایت کا ایک رجحان اسلامی ہند میں ''اسلامی شریعت'' یا قانون کو اس طور پر سمجھتا ہے کہ مادی احوال اور ہنگامی حالات کے لیے یہ نہیں ہے بلکہ یہ بہت قریب سے وجودیاتی یا موضوعی سوالوں سے وابستہ ہے۔ میری معلومات میں مشرقی ایشیا اور ایران کے روایتی اسکالرز اس روایت کی آخری علامت رہ گئے ہیں جہاں مذہبیت کے روحانی اور دینیاتی زاویوں کو بڑی احتیاط کے ساتھ قانونی خطاب کے ایک حصہ کے بطور اختیار کیا جاتا ہے۔ اوپر کی مثالوں سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ کس طرح قانون سازی کا عمل روحانیت سے گہرائی کے ساتھ پیوست ہے۔ یعنی ایک فقیہ اس تصور کے مطابق محض استدلالیت پر عامل نہیں ہوتا بلکہ وہ روحانیت اور تقویٰ سے بھی اثر پذیر ہوتا ہے۔

شیخ یعنی روحانی پیشوا کے رول کے سلسلہ میں گفتگو کرتے ہوئے، عہد وسطیٰ کے ہندوستان میں، لارینس نے بھی مختصراً متقی فقہا کے کردار کو تقریباً اسی طرح ذکر کیا ہے جیسے قاری طیب کرتے ہیں کہ ''قوم میں مشائخ مخصوص زمانہ میں خدا کی مشیت کے ترجمان ہوتے ہیں۔ وہ قرآن اور سنت کی زندہ تقدیس ہوتے ہیں۔ وہ قصہ، کہانی، شعر و شاعری کے ذریعہ صحیح نکتۂ نظر اور حسن کردار پر زور دیتے ہیں۔ بعض اوقات روحانی مجاہدہ کی مشقت سے راحت دینے کے لیے بھی ان چیزوں کو کام میں لاتے ہیں۔ ایک شیخ پرہیزگاری کا پیکر ہوتا ہے۔ علم و امید کی جوت جگاتا ہے۔ وہ عبادت کرتا ہے، تعلیم دیتا ہے اور تعلیم دیتا اور عبادت کرتا ہے'' (۶۲)۔ مختصراً روحانی اور اخلاقی تشکیل روحانیت پسند فقہا کی عادت ثانیہ بن جاتی ہے اور قانون سازی یا روزمرہ کی زندگی میں اخلاقی و روحانی قدروں کی رعایت بھی خدا کو اتنی ہی مطلوب ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ یہ کہنا زیادہ درست ہوسکتا ہے کہ قاری طیب صاحب کے خیال میں فقیہ قدرت کا آلہ کار ہے، اور اس معنی میں فقیہ کا رول پیغمبرانہ ہوجاتا ہے کیونکہ وہ وراثت نبوت کا حامل ہے اور خدائی الہام کا مخاطب (مُحدَث) بھی۔

حوالہ جات وحواشی

۳۸۔ ایضاً ص ۶۵

۳۹۔ ابوحامد محمد بن غزالی: کتاب التوحید والتوکل، احیاء علوم الدین (بیروت دارالکتب العلمیہ ۱۴۲۴ھ/۲۰۰۲ء) ۴/۹۱۲

۴۰۔ طیب، ص، ۲۵

۴۱۔ اخلاقیات میں باطنی یا سری علوم کے کردار کے لیے دیکھیے: محبّ اللہ ابن عبدالشکور، مسلم الثبوت فی اصول الفقہ ۲/۱۰۴۔۲۰۴

۴۲۔ قاری طیب ص، ۶۲

۴۳۔ ایضاً، ۷۲

۴۴۔ معطلہ کے بارے میں مطالعے کے لیے دیکھیے، Louis Massignon/ Essay on the Origins of the Technical Language of Islamic Mysticism, trans. Benjamin

Clark (Notre Dame, Indiana: University of Notre Dame Press 1997) 95

۴۵۔۔پانوپٹیکن کا حوالہ فوکالٹ سے لیا گیا ہے جو جیرمی بنتھم کے ٹاور کا استعمال کیا ہے، جس سے جیل کے تمام قیدی اچھی طرح دیکھے جا سکتے تھے۔ دیکھیے مائکل فوکالٹ:

Discipline & Punish: The Birth of the Prison (trans.) Alan Sheridan (New York: Vintage Books, 1995),p.200

۴۶۔قاری طیب ص، ۲۷

۴۷۔تقی الدین احمد ابن تیمیہ، ترتیب، امیر الجزار اور انور الباز: معجم الفتاوی، (دار الوفاء ۱۴۱۹ھ/۱۹۹۸ منصورہ، مصر) ۲۹/۱۹

۴۸۔ایضا

۴۹۔قاری طیب ص، ۶۰

۵۰۔ایضا ص، ۴۰

۵۱۔ایضا

۵۲۔دلچسپ بات ہے کہ آدم اسمتھ نے ''خفیہ ہاتھ'' (invisible hand) کے لفظ کو مختلف طریقوں سے استعمال کیا ہے۔ ایک جگہ فلکیات کے تناظر میں تحقیر و مذمت کے معنی میں اس لفظ کو استعمال کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ حتی کہ دور قدیم کے ناواقفوں نے بھی غیر معمولی ترقیات کو مشتری کے خفیہ ہاتھ کی طرف منسوب نہیں کیا۔ The Moral Sentiments میں اس کا استعمال خوشی کے ذرائع کی تقسیم کے حوالے سے ہوا ہے۔ اور In The Wealth of the Nations میں انہوں نے اس کا استعمال مفاد عامہ کے فروغ کے لیے کیا ہے۔ دیکھیے:

AdamSmith and D.D.Rapahel,Macfied,A.L.The Theory of Moral Sentiments (Indianapolis:Liberty Fund/Oxford Press,1984) p.184 esp.fn.7

۵۳۔قاری طیب ص، ۶۰

۵۴۔ Hayden White, Foreword to Reinhart Koselleck, The Practice of Conceptual History: Timing History, Spacing Concepts (Stanford, CA: Stanford University Press, 2002), x.

۵۵۔ Hayden White, Foreword to Ibid., xi.

۵۶۔ ایضا

۵۷۔ Reinhart Koselleck, Futures Past: On the Semantics of Historical Time, trans. Keith Tribe (Cambridge, Mass & London: The MIT Press, 1985), xxii. Also see Johann Gottfried Von Herder and Michael N. Forster (trans & ed.), Philosophical Writings (Cambridge:Cambridge University Press,2002

۵۸۔قاری طیب ص،۴۶

۵۹۔دیکھیے:

Mehr Afroz Murad, Intellectual Modernism of Shibli Nu`mani (Lahore: Institute of Islamic Culture, 1976); Muhammad Khalid Mas`ud, Iqbal's Reconstruction of Ijtihad (Lahore: Iqbal Academy Pakistan, 2003).

۶۰۔Bruce B. Lawrence, "Introduction to the 2005 Edition," in The Muqaddimah, ed. Franz Rosenthal and N.J. Dawood (Princeton & Oxford: Princeton University Press, 2005),p. viii.

۶۱۔ایضا

۶۲۔ miriam cooke and Bruce B. Lawrence, "Introduction," in Muslim Networks: From Hajj to

''جہاد، مزاحمت اور بغاوت

اسلامی شریعت اور بین الاقوامی قانون کی روشنی میں''

o شریعت کے مستقل اور غیر مستقل احکام o دار الاسلام اور دار الحرب کی تقسیم o اسلامی ریاست اور دار الاسلام o بین الاقوامی قانون کی حجیت کا مسئلہ o بین الاقوامی قانون میں جنگ کا جواز o فریضۂ دفاع کی وسعت اور اعانت کی حدود o اذن امام اور استطاعت کی بحث o غیر مسلموں کے ساتھ امن معاہدات o جنگی آداب کے متعلق بین الاقوامی قانون o جنگی آداب کے لیے معاہدات کی حجیت o جنگی آداب کے متعلق قواعد عامہ o مقاتلین اور غیر مقاتلین میں تمیز کا مسئلہ o عہد شکنی کی ممانعت اور جنگی چال کی اجازت o قیدیوں کے متعلق قانون o خودکش حملوں کی شرعی حیثیت o دہشت گردی: قانون اور شریعت کی روشنی میں o خانہ جنگی اور بغاوت کے متعلق بین الاقوامی قانون o خروج کی شرعی حیثیت o دہشت گردی کے خلاف عالمی جنگ کی قانونی حیثیت o لال مسجد کا سانحہ اور حنفی فقہ

تصنیف: **محمد مشتاق احمد**

(اسسٹنٹ پروفیسر قانون، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد)

دوسرا ایڈیشن، مصنف کی طرف سے نظر ثانی اور اضافہ جات کے ساتھ

[صفحات: ۷۶۰۔ قیمت: ۴۰۰ روپے]

(مکتبہ امام اہل سنت پر دستیاب ہے)

کے۔ایم۔اعظم*

سرسید احمد خان کی سیاسی فکر اور اس کے نتائج واثرات

ایک تنقیدی جائزہ

برصغیر ہندو پاکستان کے مسلمانوں کی صد سالہ سیاست (۱۸۳۵ء تا ۱۹۴۷ء) پر دو اشخاص مکمل طور پر چھائے ہوئے ہیں۔ ایک ہیں لارڈ تھامس میکالے (۱۸۰۰۔۱۸۵۹) اور دوسرے ہیں سرسید احمد خان (۱۸۱۷۔۱۸۹۸)۔ جب انگریز کانگریس کے ذریعے ہندوؤں پر غلبہ پانے میں ناکام رہ گئے تو اُن کی توجہ ہندوستان کے مسلمانوں کی طرف مبذول ہوگئی۔ مسلمانوں پر غلبہ حاصل کرنے میں سرسید احمد خان نے انگریزوں کا ہاتھ خوب بٹایا۔ انہوں نے مسلمانوں کو ہندوؤں کے اثر ورسوخ سے نکالنے کے لیے دو قومی نظریہ پیش کیا۔ سرسید احمد خان کے فلسفہ اور ان کی مسلسل جدوجہد نے ہندی مسلمانوں کو سیاسی آزادی تو دلوادی مگر انہیں انگریزوں کا ذہنی غلام بنا دیا۔ اُنہوں نے یہ پروگرام ایسی مضبوط لائنوں پر استوار کیا کہ ہم آج تک فرنگیوں کی ذہنی غلامی سے نہ نکل پائے۔

لارڈ میکالے نے ہندوستان میں چار سال (۱۸۳۴ تا ۱۸۳۸) قیام کیا۔ اپنے اس قیام کے بعد جب وہ برطانیہ واپس پہنچا تو اُس نے ہاؤس آف لارڈز میں ۲ فروری ۱۸۳۵ء کو یہ تقریر کی:۔

> ''میں نے ہندوستان کے شمال سے جنوب تک اور مشرق سے مغرب تک پالکی میں بیٹھ کر سفر کیا ہے۔ اس سفر کے دوران مجھے سارے ہندوستان میں نہ تو کوئی فقیر ملا اور نہ ہی کوئی چور۔ میں نے ہندوستان کے مال و دولت اور اس کے باشندوں کی بے پناہ قابلیت اور اعلیٰ اخلاق کا مشاہدہ کیا۔ میرے خیال میں ہم اس ملک کو کبھی بھی فتح نہ کرسکیں گے۔ اگر ہم نے اس ملک کو فتح کرنا ہے تو ہمیں اس کی ریڑھ کی ہڈی کو توڑنا پڑے گا جو کہ اس کا روحانی اور ثقافتی ورثہ ہے۔ چنانچہ میرا مشورہ یہ ہوگا کہ ہم ان کے قدیم نظام تعلیم اور تمدن کو کلی طور پر بدل دیں۔ یہاں تک کہ ہندوستانی یہ محسوس کرنے لگیں کہ غیر ملکیوں کی ثقافت اور اُن کی انگریزی زبان ہماری ثقافت اور زبان سے بہتر ہے۔ اس طرح وہ اپنا وقار، عزت نفس اور ثقافت کو کھو دیں گے۔ جب یہ ہوگا تو ہم اُن کو اپنے مقاصد کے حصول کے لیے ڈھال لیں گے اور وہ حقیقتاً ایک غلام قوم بن جائے گی۔''

فرنگیوں کے اس پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کے لیے سرسید احمد خان نے ایک بے مثل کردار ادا کیا جس کا اندازہ

* km.azam@hotmail.com

آپ اُن کے ان خیالات سے لگا سکتے ہیں۔ مندرجہ بالا لارڈ میکالے کی تقریر کے فقط ۴۳ سال بعد سرسید احمد خان علی گڑھ کی سائنٹیفک سوسائٹی کے سیکرٹری کولنڈن سے اپنے خط مورخہ ۱۵ اکتوبر ۱۸۶۹ء میں رقمطراز ہیں:۔

''انگریزوں کی خوشامد کئے بغیر، میں یہ کہنا چاہوں گا کہ ہندوستان کے باشندے خواہ ان کا تعلق اونچے درجے سے ہو یا نچلے درجے سے، سوداگر اور چھوٹے دوکاندار، پڑھے لکھے اور اَن پڑھ جب اُن کا موازنہ انگریزوں سے اُن کی تعلیم، اخلاق اور حق گوئی میں کریں تو انگریزوں کی قابلیت اور وجاہت کے مقابلے میں ہندوستانیوں کی حالت ایسے ہے جیسے ایک گندے جانور کی۔''

یقین نہیں آتا کہ ہندوستانی قوم صرف ۴۳ سال میں گندگی کے جوہڑ میں گر جائے گی۔ ۱۸۳۵ء میں تو لارڈ میکالے ہندوستانیوں کو ایک نہایت اعلیٰ وارفع قوم گردانتا ہے جبکہ ہمارے اپنے ممدوح سرسید احمد خان ۱۸۶۹ء میں ان پر ذلت اور خواری کا لیبل لگا رہے ہیں۔ سرسید احمد نے اگر کوئی سیاسی سبق دیا تھا تو وہ یہ تھا کہ مسلمان ہند اپنی زبان اور عمل سے انگریز حکمرانوں کو یہ یقین دلا دیں کہ وہ اُن کی وفادار رعیت ہیں۔ سرسید احمد خان نے مسلمانوں کو انگریزوں کے اطاعت کا سبق دیا۔ اُنہوں نے ہندی مسلمانوں کو نصیحت کی کہ وہ نوکریوں اور مراعات کے لیے انگریزوں سے التجا کریں، بطور حق نہ مانگیں، جیسے اُن کی زندگی کا مقصد بس ان قلیل مادی مراعات کے سوا اور کچھ بھی نہ ہو۔ سرسید کو انگریزوں اور انگریزی زبان سے اس قدر محبت تھی کہ وہ اپنے سب بچوں کے نام بھی انگریزوں کے ناموں پر رکھنا چاہتے تھے۔ اُن کو افسوس یہ تھا کہ وہ فقط اپنے ایک پوتے، سر راس مسعود، کو ہی انگریزی نام دے سکے۔

حکومت برطانیہ کے سرکاری ریکارڈ پر ایک نظر ڈالنے سے یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ ہندوستان میں انگریز حکمرانوں کی پالیسی ''تفرقہ ڈالو اور حکومت کرو'' پر مبنی تھی۔ وزیر ہند' چارلس ووڈ گورنر جنرل' لارڈ ایلگن کو رقمطراز ہیں کہ ''ہندوستان میں ہماری طاقت کا راز ایک حصے کو دوسرے حصے سے لڑانے میں ہے۔ چنانچہ ہمیں اس حکمت عملی پر قائم رہنا چاہئے۔ تمہیں اپنا پورا زور اس بات پر لگا دینا چاہئے کہ ہندوستانیوں میں کوئی مشترکہ عوامی جذبہ نہ ابھرنے پائے۔'' وزیر ہند جارج ہیملٹن گورنر جنرل لارڈ کرزن کو اپنے 26 مارچ 1886ء مراسلہ میں یہ مشورہ دیتے ہیں ''کہ تعلیمی درسی کتب اس طرح سے ترتیب دی جائیں کہ وہ دونوں قوموں میں اختلافات کو اجاگر کریں''۔ یہی انگریز حکمرانوں کا تاریخ ہند کو مسخ کرنے کا طریق کار تھا جس میں انہوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کو دو متحارب کیمپوں میں بانٹ دیا جن کے درمیان کوئی بھی شے مشترک نہ تھی۔ ان کی اسی تقسیم نے بعد میں دوقومی نظریہ کے لیے راستہ صاف کیا۔

یہودی نژاد وائسرائے ہند، لارڈ ریڈنگ وزیر ہند کو اپنے 21 ستمبر 1922ء کے مراسلہ میں رقمطراز ہیں کہ وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان مکمل تفرقہ ڈالنے میں قریب قریب کامیاب ہو گئے ہیں اور اس مقصد کو حاصل کرنے میں اُنہیں سر محمد شفیع کی بھرپور اعانت حاصل ہے، جو کہ ایک باوقار مسلمان ہیں۔ بے شک ہندو گماشتے بھی ایسی خدمات سرانجام دے رہے تھے۔ بالآخر برطانوی استعمار اپنی سازش میں پوری طرح کامیاب ہو گیا۔ ہندو مسلم اتحاد قصہ پارینہ بن گیا۔ ہندو مسلم فسادات جگہ جگہ پھوٹ پڑے اور فرقہ وارانہ کشیدگیاں نفرت کے قالب میں ڈھل گئیں۔ بے

شک ایک استعماری حکومت ایک محکوم ملک کے اندرونی اتحاد کی خواہشمند نہیں ہو سکتی۔

مقام حیرت ہے کہ کس طرح دس کروڑ جنگجو، جہادی مسلمانوں پر مشتمل قوم، جس نے آٹھ سو سال تک ہندوستان پر بلا خوف اور بلا شرکت غیرے حکومت کی تھی یکدم ایک خوفزدہ اقلیت میں تبدیل ہو کے رہ گئی۔ بے شک مسلمان ہندوستان میں ایک اقلیت تھے مگر وہ ایک کمزور اقلیت نہ تھے اور ہندوستان کے مارشل شمالی صوبہ جات میں اکثریت میں تھے اور ان کی حیثیت ہندوستانی فوج اور پولیس میں ریڑھ کی ہڈی کی سی تھی۔ کتنی دردناک بات ہے کہ آج تک ہم سر سید احمد خان کی دی ہوئی عقلی و مادہ پرستانہ تعلیمات کو نہیں بھولے۔ یہ اُنہی کی تعلیمات کا ہی اثر تھا کہ ہم نے اپنی تحریک آزادی کی جدوجہد کی زمام بھی فرنگی پرست اشرافیہ کے طبقے کے حوالے کر دی، جو آج تک ہم پر مسلط ہیں اور ہم قیادت کی شمع اصحاب علم وفہم کے حوالے نہیں کر پائے۔

محترم ڈاکٹر اسرار احمد کے بقول ہندوؤں کی عددی اکثریت کا خوف ہی مطالبہ پاکستان کی بنیادی وجہ تھی، جبکہ اسلام کے نعروں کی ضروری مگر ثانوی حیثیت تھی۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا پاکستان کی بقا ہندوؤں کے خوف اور نفرت اور اسلام کے نعروں پر ہے۔ عجیب اتفاق ہے کہ آج کل نفاذ اسلام کے بلند بانگ نعرے بلند کرنے والے تقریباً سارے کے سارے علما قیام پاکستان کے مخالف تھے۔ سوال یہ سر اٹھاتا ہے کہ اگر ہندو کا خوف ہی تخلیق پاکستان کی بنیادی وجہ تھا تو پھر مسلمانوں کی ایک کمزور اقلیت کو ہندو اکثریت کے رحم وکرم پر چھوڑنا کہاں کی عقل مندی تھی۔ اسلام کی ابدی حکمت نفرت پر نہیں، عالمگیر اخوت انسانی اور محبت کی فراوانی پر مبنی ہے۔

یہی مقصود فطرت ہے، یہی رمز مسلمانی
اخوت کی جہانگیری، محبت کی فراوانی

(بانگ درا)

افغانستان میں وسیع علاقوں پر اتنا لمبا عرصہ قائم رہنے والے قتل وغارت اور دنگا وفساد کے بعد جب ۲۰۰۲ء میں کابل میں لوئیہ جرگہ منعقد ہوا تو افغان قائدین نے یہ سوال اٹھایا کہ ہمارے ہیرو کون ہیں؟ بے شک ایک زندہ قوم کی یہی نشانی ہوتی ہے کہ انہیں یہ احساس ہوتا ہے کہ اُن کے ہیرو کون ہیں۔ جہاں تک ہمارا اپنا تعلق ہے ہم حقیقت کو پانے سے قاصر رہ جاتے ہیں کیونکہ ہمارا رویہ ظاہر پرستی اور گہرائی میں نہ جانے کا ہے۔ چنانچہ قومی سطح پر ہمیں اپنے ہیروز کا صحیح شعور نہیں ہوتا۔ سر سید احمد خان نے دوقومی نظریہ پر مسلمانوں کو اکٹھا کیا اور پھر ان کے نئے ملک کو چلانے کے لیے علی گڑھ کے ذریعے ایک بیوروکریسی کا بھی بندوبست کر دیا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے بیوروکریٹ عموماً سر سید احمد کے مداح ہیں جبکہ اسلام کی طرف مائل عوام انہیں اچھا نہیں سمجھتے۔

قومی اصلاح کے لیے ہمارے ہم وطنوں کے اٹھائے ہوئے پرعزم اقدام بار بار زمینی حقائق کی سنگلاخ چٹانوں سے ٹکرا کر پاش پاش ہو چکے ہیں۔ موجودہ حالات میں ایک عام شہری کو شدید پریشانیوں کا سامنا ہے اور وہ بے بسی کے عالم میں کسی نجات دہندہ، مہدی یا مسیحا کے ظہور کا منتظر ہے۔ عسکری قیادت کی لائی ہوئی تبدیلیوں کا پراشتیاق استقبال کرنے کے بعد عوام ہر بار انقلاب کے ظہور سے ناامید ہو کر دل شکستگی اور نفسیاتی پژمردگی کا شکار ہو رہے ہیں اور اب تو

یہ خطرہ بھی لاحق ہوگیا ہے کہ کہیں وہ پاکستان سے ہی مایوس نہ ہوجائیں۔

ملک کے اکابرین اور دانشور استحکام پاکستان کے لیے متنوع انواع کی تجویزات اور لائحہ عمل تشکیل کر رہے ہیں۔ آج کل ان میں ایک ہیجانی کیفیت پائی جاتی ہے۔ شاید اس لیے کہ مسائل گمبھیر ہیں اور وقت بہت کم۔ بے شک ان کی یہ کوششیں قابل تحسین ہیں مگر ان سب میں ایک ہی کمی پائی جاتی ہے اور وہ ہے کہ ہمارے سب مصلحین کی توجہ فروعی مسائل اور زمینی مشکلات پر مرکوز رہتی ہے، جبکہ حقیقی مسائل پر کوئی توجہ صرف نہیں کی جاتی۔ شاید اس بنیادی غلطی کی وجہ سے قومی اصلاح کا کوئی لائحہ عمل متوقع نتائج برآمد کرنے سے قاصر رہ جاتا ہے۔ بقول حضرت سعدیؒ

خشت اول چوں نہد معمار کج
تا ثریا می رود دیوار کج

ہماری قوم تعبیر کی دو بنیادی غلطیوں کی وجہ سے پریشان حال ہے اور اسے مسلسل کوشش کے باوجود قومی انحطاط کا کوئی حل نظر نہیں آ رہا۔ پہلی تعبیر کی غلطی ہمارے ممدوح سرسید احمد خان سے ہوئی جب انہوں نے قوم رسول ہاشمی کی ترکیب کو اقوام مغرب پر قیاس کر کے اسے زوال سے نکالنے کا جو طریق کار مادہ پرستی، ملازمتوں کے حصول اور انگریزوں کی رضا جوئی کی شکل میں پیش کیا وہ دور اندیشی اور تاریخ کے عمیق فہم پر مبنی نہ تھا۔

سرسید اور ان کے معاونین کی نیت پر شبہ نہیں کیا جا سکتا لیکن ان کی تحریک کا مہلک نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمانان ہند اپنے شاندار اور محترم ماضی سے آہستہ آہستہ دور ہوگئے۔ سرسید احمد کی تعبیر کی غلطی یہ تھی کہ انہوں نے اسباب زوال کی بنیادی حقیقت، وہن (یعنی دنیا کی محبت اور موت کا ڈر) کو نظر انداز کر کے قوم کی مادی منفعتوں کو مطلوب و مقصود بنالیا اور ان منفعتوں سے عارضی محرومی کو زوال کا حقیقی سبب جان لیا۔ بے شک ایسے انداز فکر سے مستقل قومی فلاح کی امید رکھنا خوش فہمی سے زیادہ کچھ نہ تھا۔ سرسید احمد اور ان کے رفقاء کی تربیت یافتہ نسل نے مسلمان ہند کی علمی، فکری، روحانی اور تمدنی زندگی کی مقتدر روایات کو درخود اعتنا نہ سمجھا بلکہ مادی زندگی کی آسائشوں کو ملی زندگی کے اس قابل قدر تسلسل پر ترجیح دی۔ ان کے نزدیک بقول اکبر الہ آبادی زندگی کی معراج کلرکی کرنے، ڈبل روٹی کھانے اور خوشی سے پھول جانے میں تھی۔

علی گڑھ نے حالی، شبلی اور نذیر احمد جیسی نابغہ روزگار شخصیات تو کیا پیدا کرنی تھیں، وہ ان اکابرین کی قائم کردہ روایت کو آگے بڑھانے والے حضرات بھی وجود میں نہ لا سکا۔ ایک اجنبی زبان کے ذریعے تعلیم و تدریس کے فیصلے نے برصغیر کے باشندوں کو ذہنی مرعوبیت اور مغلوبیت کا شکار کر کے ان کی تربیت کے سلسلے میں بڑی حد تک منفی کردار ادا کیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ قوم کا ایک فعال حصہ اپنی شاندار تاریخی روایات سے بے تعلق اور متنفر ہوگیا۔ علی گڑھ تحریک کی ابتداء جس اصلاحی جوش و خروش اور ترقی کے ولولہ سے ہوئی تھی وہ آہستہ آہستہ ظاہری چمک دمک، دنیوی کامیابی اور زمانہ سازی کے جذبے کے نیچے دبتا چلا گیا۔ علی گڑھ کی تربیت یافتہ نسل نے اسلام کو بھی انگریزی مصنفوں کی کتابوں کے ذریعے سمجھنے کی کوشش کی، جس کی وجہ سے ایک ناقص فہم دین اور تصوف سے دشمنی ہی اُن کے حصے میں آئیں۔

قوم ابھی اس ضرب شدید سے سنبھلنے نہ پائی تھی کہ ہمارے دینی زعما نے تعبیر کی ایک دوسری دور رس غلطی کر دی۔ انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں ہمارے آباؤ اجداد اور سیاسی و دینی رہنماؤں پر مغربی ترقی و

تسلط کا رعب اس قدر تھا کہ وہ اپنی سیاسی نجات کے لیے مغربی طریق کار کو اپنائے ہوئے تھے۔ وہ مغربی انداز فکر بالخصوص نظریہ آئیڈیالوجی سے بہت متاثر تھے، جس کے تحت افراد کی تھوڑی سی تعداد نے مختصر سے عرصے میں یورپ کے کئی ایک ملکوں پر اپنا تسلط قائم کر لیا تھا۔ یہ مغربی ترقی و تسلط کا اثر تھا کہ ہمارے سیاسی، علمی اور دینی زعما نے مغربی فکر کو تقریباً کلی طور پر اپنا لیا، یہاں تک کہ تاویل کے ذریعے قرآن کے ابدی پیغام کو بھی مغربی فکر کے ہم آہنگ کرنے کی مسلسل کوششیں کی گئیں۔ ان کے مغرب کی طرف فکری جھکاؤ نے ان کو آئیڈیالوجی کی اساس پر غلبہ اسلام کے تصور سے روشناس کروایا۔ یہ اسی سیکولر فکری روایت کا اثر ہے کہ ہمارے دینی زعما اب بھی سسٹم یا نظام کی بات کر رہے ہیں اور انہیں اس بات کا احساس نہیں کہ ایک مسلمان کے لیے اس کی باطنی اور ظاہری قوت کا راز تعلق باللہ میں ہے۔ مسلمانوں کی تاریخ ہمیں یہ بتاتی ہے کہ اگر ان کے حکمرانوں کا اللہ کے ساتھ تعلق برحق تھا تو ہر قسم کے سیاسی نظاموں یا اداروں نے اچھے نتائج پیدا کیے اور جب کبھی یہ تعلق ماند پڑ گیا تو کوئی بھی ادارہ بشمول خلافت اچھے نتائج پیدا نہ کر سکا۔

مغرب کے سامراجی غلبہ کے تحت ہم نے زندگی کے ہر شعبہ میں مغربی انداز فکر کو اپنا لیا، جس کے تحت روحانی ترقی کو پس پشت ڈال کر ہم نے مادی ترقی کو ہی مطمح نظر بنا لیا۔ اس نظریاتی تغیر (Ideological Shift) نے ہماری قومی زندگی پر بہت دور رس نتائج مرتب کیے۔ مثلاً یہ کہ غلبہ طاقت سے حاصل کیا جا سکتا ہے نہ کہ اخلاق سے۔ نتیجتاً ہماری قوم کی توجہ انسان سازی کے اسلامی طریق کار سے ہٹ کر مغربی نظریات، ابلاغیات (Mass Media) اور عوامی تحریکوں (Mass Movements) پر مرکوز ہو گئی اور ہمارا مطمح نظر ووٹوں کا حصول جا ٹھہرا۔ شمع سے شمع جلانے کا قدیم فن ختم ہو گیا اور ہمارے دینی زعما اس سوئچ کی تلاش میں سرگرداں ہو گئے، جس کے دبانے سے ساری کی ساری بتیاں یک لخت جل اٹھیں۔ اس دنیاوی کشمکش میں وہ اپنے اندر کی بتی بھی جلانا بھول گئے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ہمارے دینی زعما کو باہر کی دنیا تو نہ ملی مگر ان کے اندر کی دنیا برباد ہو کر رہ گئی۔ ہم ظاہری دنیا میں اتنا گم ہوئے کہ اندر کے انسان کو بھول گئے۔ ہمیں سوچنا چاہیے کہ پچھلی صدی کے دوران غلبہ اسلام کے نام پر اٹھنے والی کوئی جماعت کسی بھی مسلمان ملک میں کیوں کامیاب نہیں ہوئی۔

ہمارے اکابرین کی اس فکری روش کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہندوستان کے مسلمان نظریاتی، معاشرتی اور روحانی بحران کا شکار ہو گئے، جس سے ہم آزادی کے چونسٹھ سالوں بعد بھی نکل نہ پائے۔ شاید ہمارے دینی اکابرین کو تاریخ کا ایک ازلی سبق یاد نہیں رہا کہ وہ قومیں جو موت سے نہیں ڈرتیں، اللہ انہیں حکمران بنا دیتا ہے اور وہ قومیں جو موت سے ڈرتی ہیں انہیں محکوم۔ دراصل توحید ہی انسانوں کو صحیح معنوں میں آزاد کرتی ہے اور وہن ان کو غلام بنا دیتا ہے۔ جب تک ہم پاکستانی اپنے دلوں کو اس ازلی حق سے آشنا نہ کر لیں گے، ہم ذہنی غلامی، حلقہ بگوشی محتاجی، اور اطاعت غیر کے گورکھ دھندوں میں مقید رہیں گے۔ تعبیر کی ان دو بنیادی غلطیوں کا خمیازہ ہم آج تک بھگت رہے ہیں۔ جب تک ہم تعبیر کی ان دو بنیادی غلطیوں کی بھول بھلیوں سے نہیں نکلیں گے قومی سلامتی اور دینی فضیلت کا راستہ ہماری نظروں سے اوجھل رہے گا۔

پاکستان ایک شدید انحطاط کے دور سے گزر رہا ہے۔ یہ پاکستان کے زیریں طبقات ہی ہیں جو پاکستان سے محبت کرتے ہیں جبکہ بالائی طبقات عموماً اس کی لوٹ کھسوٹ میں مصروف رہتے ہیں۔ ہمارے اس وطن عزیز میں سیاسی

قوت کو مال وزر سمیٹنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے جبکہ دولت کو سیاسی قوت کے حصول کا ذریعہ بنایا جاتا ہے اور یہ دونوں یعنی سیاسی قوت اور دولت فلاح کی بجائے ظلم کا موجب بنتی ہیں۔ دولت منداور بااثر افراد قانون شکنی کے باوجود قانون کے محافظ بنے رہتے ہیں۔

ہمارے پاکستانی ہم وطن گو اسلام ہی کو اپنے وطن کی اساس مانتے ہیں، مگر ہندوستان کی مسلم تاریخ سے تقریباً کلی طور پر بے بہرہ ہیں، بلکہ اس کے متعلق ناروا خیالات رکھتے ہیں، جبکہ چاہیے تو تھا یہ کہ وہ استحکام پاکستان کی بنیاد مسلم ہند کی تاریخ کے اعلیٰ شعور پر رکھتے۔ ایک طرف تو بقول علامہ اقبال ''شاید ہندوستان ہی ایک ایسا ملک ہے جس میں اسلام کی وحدت خیز قوت کا بہترین اظہار ہوا'' (خطبہ الٰہ آباد) تو دوسری طرف مسلمان حکمران اتنے وسیع اور عریض ملک میں آٹھ سو سال پر محیط ایک ایسا کثیر النسل وعقیدہ معاشرہ (Plural Society) قائم رکھنے میں کامیاب ہو گئے، جس کی مثال تاریخ انسانی میں نہیں ملتی۔ مسلمانوں کی حکومت کے دو واضح اصول مذہبی آزادی اور معاشرتی انصاف تھے۔ ہندوستان میں اپنی کثیر التعداد رعایا کے ساتھ مسلمان حکمرانوں کا میل جول عدل وانصاف ورواداری اور مروت وشفقت پر مبنی تھا اور ہندو رعایا ان کی مداح اور قدر دان تھی بلکہ ان پر دل وجان سے فدا تھی۔ اسلامی ریاست کی توسیع اور دفاع میں ہندو رعایا ہر وقت سینہ سپر رہتی اور مسلمان حکمرانوں سے انعام واکرام پاتی۔ بقول پروفیسر تھامس آرنلڈ اسلام کی تبلیغ جو مسلمانوں کا اہم نصب العین تھا بزور شمشیر نہیں کی گئی تھی۔ تمدنی طور پر مسلمانوں نے ہندوستان کی تہذیب پر نمایاں اثرات مرتب کیے۔ بقول ڈاکٹر تاراچند'' یہ بلند مرتبہ لوگ تھے اور یقیناً ان کے ساتھ کثیر تعداد میں کم شہرت یافتہ اہل دین تھے جو ہندوستان آئے اور جدوجہد کرتے رہے۔'' ہندوستان کے مسلم دور میں ہندی مسلم معاشرہ نے ایک خوشنما شکل اختیار کر لی، جس کا دارومدار اخوت کی جہانگیری اور محبت کی فراوانی پر تھا۔ اس معاشرہ کی تشکیل میں مسلم سول سوسائٹی، جس کے روح رواں مسلمان عالم، فقیہ، فلسفی، صوفی، عارف، شاعر اور ہنرمند تھے، سب نے ایک مرکزی کردار ادا کیا۔

ہندوستان کی جنگ آزادی (۱۸۵۷ء) مغل بادشاہ کے پرچم کے نیچے مسلمانوں اور ہندوؤں نے یکجا ہو کر لڑی تھی۔ ۱۹۲۰ء تک ہندو مسلم آپس میں شیر وشکر تھے۔ اس دور میں قائداعظم ہندو مسلم اتحاد کے سفیر کے طور پر پہچانے جاتے تھے۔ مگر ۱۹۲۰ء کے بعد انگریز حکمرانوں نے انتشار، نفاق اور نفرت وحقارت کی خوب آبیاری کی اور ہندو اور مسلمانوں کے درمیان تفرقہ ڈالنے میں کامیاب ہو گئے۔ سرسید احمد خان شروع میں ہندو مسلم اتحاد کے زبردست پرچارک تھے مگر پھر اچانک اُنہوں نے ہندوؤں کی عددی اکثریت کا ہوا کھڑا کر دیا اور مسلمانوں کو خود اعتمادی سے محروم بنانے اور خوف وہراس کا شکار کرنے پر کمربستہ ہو گئے۔ سرسید احمد خان کو اس شے کا احساس نہ تھا کہ قوت کا دارومدار تعداد پر نہیں بلکہ کردار اور روحانی طاقت پر ہوتا ہے۔ جنگ آزادی کے جانثاروں کو مطعون ٹھہرانے والے بھی ہمارے ممدوح سرسید احمد خان ہی تھے۔

دور حاضر میں ان دو قوموں کے درمیان محبت اور نفرت کے دریا ساتھ ساتھ بہہ رہے ہیں۔ کسی فرد کے مطمح نظر کا انحصار اس بات پر ہے کہ وہ کس دریا کے کنارے پر کھڑا ہے۔ دراصل دو قومی نظریہ کی ضرورت ہمیں اس وقت ہوتی ہے جبکہ مسلمان تکثیر میں کمزور عنصر بن کے رہ جائیں اور ان کو یہ خطرہ لاحق ہو جائے کہ وہ اپنے دین کا تحفظ نہ کر پائیں گے یا پھر ان کا دین ان کا تحفظ نہ کر سکے گا۔ پاکستان میں غیر مسلموں کی تعداد فقط دو فیصد ہے، اس لیے اب ہم کو دو قومی نظریہ

کی ضرورت نہیں۔ دوقومی نظریہ کے تناظر میں دراصل بات سمجھنے کی یہ ہے کہ مسئلہ زبان ونسل کا نہیں ہے۔ درحقیقت دو قومی نظریہ کی اصل اساس قرآن کریم مہیا کرتا ہے۔ قرآنِ کریم کلمہ طیبہ اور کلمہ خبیثہ کی صورت میں دو نظریات حیات پیش کرتا ہے۔ کلمہ طیبہ کی مثال ایک ایسے صالح درخت کی ہے، جس کی جڑیں تو زمین کی گہرائی میں ہوں مگر شاخیں آسمان تک پہنچی ہوئی ہوں اور ہمہ وقت پھل سے لدی ہوئی ہوں۔ اس کے برعکس کلمہ خبیثہ کی مثال ایک بدذات درخت کی سی ہے، جو زمین کی سطح سے اکھاڑ پھینکا گیا ہو (۱۴:۴۲ تا ۲۷)۔ کلمہ طیبہ (توحید، رسالت اور آخرت) پر ایمان رکھنے والے لوگ، قوم حقہ، کہلاتے ہیں، جبکہ کلمہ خبیثہ (شرک، بے حیائی اور فحاشی) کے پیروکار، قوم باطلہ، قرار دیے جاتے ہیں۔ ان دو جماعتوں کو قرآنِ حمید حزب اللہ (۵:۶۵؛ ۸۵:۲۲) اور حزب الشیطان (۸۵:۹۱) بھی کہتا ہے۔ دراصل دوقومی نظریہ انہی دو قوموں کے درمیان خط تقسیم ہے۔ یہ ایسا خط ہے، جو باپ کو بیٹے سے اور بھائی کو بھائی سے متصادم کرا دیتا ہے۔ اس دوقومی نظریہ کے سامنے تو وطن، زبان، جغرافیہ اور تاریخ حتیٰ کہ حسب ونسب بھی ملیا میٹ ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ اس پیرائے میں ہمیں اپنے معاشرتی حالات کا بھی محاسبہ کرنا ہوگا کیونکہ قرآنِ کریم سرکشوں کو کبھی معاف نہیں کرتا، خواہ وہ انبیاء کے قریبی رشتے دار ہی کیوں نہ ہوں (ھود:۴۶)۔

ہمیں یہ بھی جان لینا چاہیے کہ دوقومی نظریہ کی بنیاد وطن پرستی (Nationalism) پر ہے جسے علامہ اقبال مذہب کا کفن قرار دیتے ہیں۔ انسانی وحدت کا مغربی تصور مشترکہ زبان، نسل اور علاقہ پر مبنی ہے۔ جبکہ انسانی وحدت کا اسلامی تصور ایک مشترکہ مطمحِ نظر ہے۔ حضرت علامہ اقبال تادم آخر دور حاضر کے تین فتنوں وطنی قومیت (Territorial Nationalism) دین و ریاست کی دوئی (Secularism) اور دہریانہ مادہ پرستی (Atheistic Materialism) کے خلاف برسر پیکار رہے۔ یہ تینوں فتنے ایک دوسرے سے مربوط ہیں۔ لادینیت ہی مادیت کی اساس ہے اور مادیت کا وطنی قومیت کے ساتھ چولی دامن کا ساتھ ہے۔ مادیت ہی سے غلبہ بالقوہ کا تصور ابھرتا ہے جو تشدد کو جنم دیتا ہے۔ یہ مادی انداز فکر ہی تھا جس کے باعث اللہ کی مخلوق پر پچھلی صدی میں دو خوفناک جنگیں مسلط کی گئیں۔ جب مادیت زیادہ قوت پکڑتی ہے تو وطن پرستی سے نسل پرستی اور قبیلہ پرستی کی طرف سفر کرتی ہے اور پھر اللہ کی زمین پر ہر طرف فساد برپا ہو جاتا ہے اور وہ عبادت گاہیں جن میں صبح وشام اللہ کا نام لیا جاتا ہے، تباہ وبرباد ہو جاتی ہیں (البقرہ:۱۱۴)۔

جنگ و جدل سے مغلوب یورپ کے مقتدر دانشور اور مؤرخ آرنلڈ ٹائن بی (Arnold Toynbee) نے ۱۹۵۲ء میں اس خیال کا اظہار کیا تھا کہ مغربی وطن پرستی کی روایت عالم اسلام کے لیے ایک مشتبہ نعمت ہے۔ ان کے خیال میں عالم اسلام کے لیے یہ بہتر ہوتا کہ وہ مختلف مملکتوں میں بٹ جانے کی بجائے اسلام کی اخوت پر ایک علاقائی ریاست (خلافت) کی ترویج کرتے تو ان کا یہ عمل عالمی اخوت انسانی کے قیام کی طرف ایک مثبت قدم ہوتا، جس کی جوہری اسلحہ کے اس دور میں اشد ضرورت ہے۔

اسی پیرائے میں علامہ اقبال کی فکری کاوش اور قائداعظم کی سیاسی جدوجہد ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے ایک خطہ ارضی حاصل کرنے تک محدود نہ تھی بلکہ ان کا مطمحِ نظر اس خطہ زمین کے لیے اسلام کے آفاقی نصب العین کی طرف پیش قدمی تھا۔ مگر پاکستان کے معرض وجود میں آنے کے بعد اس طویل عرصے میں اسلام کی آفاقی نصب العین کی

طرف پیش رفت تو درکنار، ہم اسلام کا مرحلہ بھی طے نہ کر پائے۔ آج تو حالات اس ڈگر کو پہنچ گئے ہیں کہ ملک میں دہشت گردی اور قتل وغارت کا بازار گرم ہے۔ مسجدیں تک محفوظ نہیں رہیں اور اسلام وحدت سازی کے اعتبار سے بے اثر ہوتا جا رہا ہے۔ اگر وحدت خیز قوت کی حیثیت سے اسلام پاکستان ہی میں بے اثر رہ گیا تو دنیا میں انسانی اخوت کی ایک عالم گیر تحریک برپا کرنے میں کیا کردار ادا کر سکے گا۔؟

سرسید احمد خان کا مذہبی فکر کمزور تھا جبکہ دنیاوی فکر کے وہ بادشاہ تھے۔ سرسید احمد خان رُوح اور فرشتوں پر یقین نہ رکھتے تھے اور وحی کے متعلق اُن کا علم ناقص تھا۔ سرسید احمد خان مسلمانوں کے لیے ایک کامیاب ریاست کے خواہاں تھے۔ اُن کا مطمح نظر ایک اسلامی ریاست کا قیام نہ تھا۔ قائداعظم بھی مسلمانوں کے لیے ایک کامیاب ریاست قائم کرنا چاہتے تھے۔ قائداعظم کے لیے اسلام ایک بنیادی مسئلہ نہ تھا۔ قائداعظم پاکستان کے مسلمانوں کی ایک جدید، جمہوری اور فلاحی ریاست کے آرزومند تھے۔ ایک کٹر رجعت پسند، جہادی ریاست کا تصور ان کے ذہن میں نہ تھا۔ بہرحال قائداعظم ایک سیاست دان تھے اور انہوں نے موقعہ محل کے مطابق کئی باتیں کیں جو شاید ظاہراً متضاد نظر آئیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان کے اس موضوع پر تمام بیانات اور تقاریر کا تقابلی مطالعہ کر کے کوئی رائے قائم کی جائے۔ اس موقع پر قائداعظم کے قریبی ساتھی امیر محمد خان راجہ محمود آباد کا مضمون ''چند یادیں'' قابل غور ہے:۔

''لمبی زندگی اور فکری پختگی سیاسی تحریکوں کے لیے بھی اتنی اہم ہے جتنی کہ انسانوں کے لیے۔ جس تیزی اور تندی کے ساتھ مسلم لیگ کو دس سال کے مختصر عرصہ میں پاکستان کے ہدف کی طرف بڑھنا پڑا اس میں تنظیم کی تطہیر نہ ہو سکی۔ مسلم لیگ کو اپنی تیز رفت کامیابی کی قیمت ادا کرنی پڑی۔ اس کی بینڈ گاڑی پر مختلف انواع کے لوگ سوار ہو گئے ان میں سے کچھ لوگ قدامت پسند تھے، جو لیگ کے ترقی پسند پروگرام میں رکاوٹ بنے۔ پھر اس میں جاگیردار اور سرمایہ دار بھی آ گھسے، جنہوں نے قدامت پسند لوگوں کے ہاتھ مضبوط کئے۔ لیگ کی تیز رفتار بینڈ گاڑی پر رجعت پسند لوگ بھی آن سوار ہوئے جن کی فکر ایام خلافت سے آگے نہ بڑھی تھی اور جن کے ذہن میں جدید ریاست کا کوئی تصور نہ تھا۔ ایک گروہ یونیورسٹی لیکچررز کا بھی تھا جو پاکستان میں ایک اسلامی ریاست کے قیام کا خواہاں تھا۔ میں (راجہ محمود آباد) بھی اس گروہ سے متاثر تھا۔ میں نے اس سوچ کو اپنی تقاریر میں زور وشور کے ساتھ اجاگر کرنا شروع کر دیا۔ قائداعظم نے لیگ کے پلیٹ فارم سے ان خیالات کے ابلاغ کو پسند نہ فرمایا اور مجھے اس قسم کی تقاریر سے منع فرما دیا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ لوگ یہ سمجھنے لگیں کہ مجھے ان خیالات کے اظہار میں قائداعظم کی تائید حاصل ہے۔ میں خیالات کے اس اختلاف کی وجہ سے قائداعظم سے دور ہوتا چلا گیا۔ مگر اب جب میں پیچھے کی طرف دیکھتا ہوں تو مجھے اپنی غلطی کا شدت کے ساتھ احساس ہوتا ہے۔''

پاکستان کے علماء اور دینی اکابرین چونسٹھ سال گزرنے کے بعد فیصلہ نہ کر پائے کہ اسلامی نظام ہے کیا؟ آج بھی اس موضوع پر کوئی محفل سجا لیں پھر دیکھیں ان کا آپس میں دست وگریباں ہو جانا۔ ہمارے علماء کو اس بات کا بھی کچھ شعور نہیں کہ فقہی نظام کی قانونی موشگافیاں اور ان کے پیدا کئے ہوئے مسائل یہودی طرز فکر کی نقل ہیں۔

ہماری خود پسندی، انانیت اور کج فہمی کا ماتم یہ ہے کہ ہم نے سمجھ رکھا ہے کہ اگر پاکستان میں یہ دین حق قائم نہ ہوا تو

کہیں بھی نہیں ہوگا۔ یہ بات بھی کہ پاکستان بنایا ہی اسلامی نظام کے قیام کے لیے تھا، تاریخی طور پر مصدق نہیں ہے۔ ''پاکستان کا مطلب کیا؟ لا الہ الا اللہ'' مسلم لیگ کا پالیسی بیان نہ تھا بلکہ اس زمانے میں سیالکوٹ کے ایک غیر معروف شاعر، اصغر سودائی کی ایک طویل نظم کا ٹیپ کا مصرعہ تھا۔ قیام پاکستان سے پہلے جب حضرت قائداعظم سے پوچھا گیا کہ آپ کے نئے ملک میں اسلام کا نقشہ کیا ہوگا؟ تو اس کے باوجود کہ وہ اسلام کے بنیادی اصولوں، حریت، اخوت اور مساوات سے کماحقہ آشنا تھے، انہوں نے فرمایا کہ میں نے تو آپ کو مسجد کے لیے جگہ لے دی ہے۔ اب قیام پاکستان کے بعد اس کا فیصلہ آپ خود کریں کہ مسجد کا طرز تعمیر کیا ہوگا۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ قائداعظم نے پاکستان کو ہمیشہ مسلمانوں کی ریاست کہا نہ کہ اسلامی ریاست۔ پاکستان کے عوام کی اکثریت بھی اسلامی ریاست کی نہیں، کامیاب ریاست کی خواہاں ہے۔ ویسے بھی ایک کامیاب ریاست بنائے بغیر اسلامی ریاست نہ بن پائے گی۔

اس مضمون کا مرکزی سوال یہ ہے کہ عالم اسلام میں اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے نام پر اٹھنے والی تحریکیں آخر کامیاب کیوں نہیں ہو رہیں؟ حالانکہ بقول ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی ہندو پاکستان میں اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے لیے جدوجہد کے پہاڑ ضائع ہو گئے۔ اب جب کہ پاکستان میں مختلف رنگ کی اسلامی جماعتوں کے سالانہ اجتماعات میں تقریباً 40 لاکھ سرگرم کارکن جمع ہونے لگے ہیں تو وہی سوال پھر ابھر کے سامنے آتا ہے کہ اتنی بڑی اسلامی حرکت کے باوجود ہمارے اس وطن عزیز کے حالات سال بہ سال، ماہ بہ ماہ، دن بدن بدتر کیوں ہوتے جا رہے ہیں؟ ہماری تبلیغ آخر اتنی بے اثر کیوں ہے؟ ہمارا جہاد رائیگاں کیوں جا رہا ہے؟ آخر کیا کمی ہے جس کی وجہ سے ہمارا مقتدر اسلامی مشن کامیابی سے ہمکنار نہیں ہو رہا؟ اللہ جل جلالہ اور رسول عالی مرتبت ﷺ کے نام پر معرض وجود میں آنے والی اس مملکت خداداد میں خاتم الرسل ﷺ کا دین قیم آخر رائج کیوں نہیں ہو پا رہا؟ گزشتہ چونسٹھ سالوں میں کئی ایک بار نفاذ اسلام کی پرجوش تحریکیں اٹھیں مگر سب کی سب یا تو زمینی حقائق کی سنگلاخ چٹانوں سے ٹکرا کر پاش پاش ہو گئیں یا پھر دینی اکابرین کے ذاتی مفادات کی نذر ہو گئیں۔ دوسرے الفاظ میں نفاذ اسلام کے بلند بانگ نعرے تو لوگوں نے بارہا سنے مگر نتیجہ کچھ بھی نہ دیکھا۔ ان حالات میں پاکستان میں ایک تشویشناک روش دیکھنے میں آ رہی ہے۔ اور وہ ہے لوگوں کی اسلام سے روز بروز بڑھتی ہوئی بیزاری۔ جب اسلام عوام کے مسائل حل نہ کر پائے گا تو لوگوں کا اس کے بلند بانگ نعروں سے بیزار ہونا ایک قدرتی ردعمل ہوگا۔ دوسری طرف بے مروت، رجعت پسند اور متشدد اسلامی تحریکیں لوگوں کو دین سے قریب لانے کی بجائے دور کر رہی ہیں۔ صدیوں پر محیط ناکامیوں کے بعد مسلمان اپنے دین اور اپنے آپ سے بددل اور ناامید ہو رہے ہیں۔ اس لیے انہیں کوئی تبدیلی کا آسان راستہ بھی بتائے تو وہ یقین نہیں کرتے اور ان کی توجہ آسانیوں کی بجائے مشکلات پر مرکوز رہتی ہے۔

پاکستان کو معرض وجود میں آئے چونسٹھ سال بیت چکے ہیں۔ اس طویل عرصے میں اسلام کے آفاقی نصب العین کی طرف پیش رفت تو درکنار، ہم نفاذ اسلام کا مرحلہ بھی نہ طے کر پائے۔ چنانچہ ہم دنیا کو یہ بتانے کے بھی قابل نہیں کہ اسلام، اقتصادی اور معاشرتی مسائل، جو آج کے انسان کو درپیش ہیں اس طرح حل کرتا ہے۔ عملی مثال کے نہ ہونے کی وجہ سے کوئی بھی اسلام کے متعلق ہمارے بلند بانگ نعروں پر اعتبار نہیں کرتا۔ آج تو حالات اس ڈگر کو پہنچ گئے ہیں کہ ملک میں دہشت گردی اور قتل و غارت کا بازار گرم ہے۔ مسجدیں تک محفوظ نہیں رہیں اور اسلام وحدت سازی کے اعتبار سے بے اثر

ہوتا جا رہا ہے۔ اگر وحدت خیز قوت کی حیثیت سے اسلام پاکستان میں ہی بے اثر رہ گیا تو دنیا میں انسانی اخوت کی ایک عالمگیر تحریک برپا کرنے میں کیا کردار ادا کر سکے گا۔ عمومی طور پر قومیت اور مادیت سے مغلوب مسلمان اسلام کی آفاقیت کو صحیح تناظر میں دیکھنے سے قاصر ہیں اور انہوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ صحیح مسلمان بس ایک روایتی مسلمان ہوتا ہے۔ ستم ظریفی تو یہ ہے کہ اس پس منظر میں انسان دوستی، احترام آدمیت اور ظلم کے خلاف جہاد کے اسلامی نظریات کا علم اب ان قوموں نے اٹھا لیا ہے جن کی وطنی قومیت اور دہریانہ مادہ پرستی نے دنیا میں ہر سو ظلم و ستم کا بازار گرم کر رکھا تھا۔

ہمارے لیے غور و فکر کا ایک نہایت ہی اہم مسئلہ یہ بھی ہے کہ چلیں انگریزی زبان میں تعلیم یافتہ طبقہ کی ناقص تعلیم و تربیت کے لیے تو ہم انگریزوں کو مطعون قرار دے سکتے ہیں لیکن اگر ہمارے مشائخ اور علماء کا کردار ہی قابل ستائش نہ ہو تو اس کے لیے کسے ذمہ دار ٹھہرائیں گے۔ اس سلسلے میں ایک غور طلب بات یہ ہے کہ مسلمان ہندوستان میں تقریباً آٹھ سو برس حکمران رہے۔ گو اس طویل دور میں ملک ہمہ وقت اسلام کی درخشاں ہستیوں سے فیض یاب رہا، مگر ان میں سے کسی ایک نے بھی کسی اسلامی جماعت کی داغ بیل نہ ڈالی اور نہ ہی سرفرازی اسلام کے لیے کوئی تحریک چلائی گئی مگر ان علماء، فقہاء اور صوفیاء نے اپنے اخلاق، تقویٰ اور بے غرض ایثار کی ایسی مثالیں قائم کیں کہ اتنا عرصہ گذر جانے کے بعد وہ آج بھی مسلمانوں کے دلوں کو گرماتی ہیں۔ ہمارے اسلامی اکابرین اسلام کے چلتے پھرتے نمونے ہونے چاہئیں۔ جب ہمارے علماء اور مشائخ ہی طاغوت کا شکار ہو جائیں گے تو ان کے منہ سے دین کی بات دین کو بدنام کرنے کے مترادف ہوگی۔ جب تک کسی تحریک کی داعی قیادت کے کردار اعلیٰ اور ارفع نہ ہوں گے اور ان کی زندگیاں تحریک کے اغراض و مقاصد سے مطابقت نہیں رکھیں گی، تو اس وقت تک اس تحریک کی کامیابی کی امید نہیں کی جا سکتی۔ پاکستان کی اسلامی تحریکوں میں یہ روایت زور پکڑ گئی ہے کہ وہ بند کمروں میں بھی اپنی تعریف ہی کرتے ہیں اور اس غلط فہمی میں مبتلا رہتے ہیں کیونکہ وہ ظاہراً اسلامی کام ہی کر رہے ہیں اس لیے انہیں اللہ کی خوشنودی حاصل ہے، جیسے انصاف کا ترازو اللہ کے ہاتھ میں نہیں، ان کے اپنے ہاتھ میں ہو۔ زمینی حقائق تو یہ پتہ دے رہے ہیں کہ وہ اب تک رضوان اللہ کے حصول میں کامیاب نہیں ہوئے ورنہ جب اللہ کی خوشنودی حاصل ہو جائے تو کسی اور کی خوشنودی کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

دراصل ہمارے علماء کی خود پرستانہ اور ذاتی مفادات کی طرف مائل تفسیریں اور فقہی ترجیحات موجودہ دور کے بڑے بت ہیں۔ دینی جماعتیں اور فرقے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول عالی مرتبت ﷺ سے زیادہ توجہ اپنے لیڈر یا امیر کو دیتے ہیں۔ ان کے اجتماعوں میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول عالی مقام ﷺ سے بڑھ کر ذکر ان کے اپنے حضرت یا مولانا کا ہوتا ہے۔ مختلف دینی جماعتوں اور تحریکوں کا یہ رویہ امت مسلمہ کو ٹکڑے ٹکڑے کر رہا ہے۔ اور اصل میں یہی فساد کی جڑ ہے۔ ہر جماعت صرف اپنے آپ کو دین کا سچا محافظ خیال کرتی ہے اور ان جماعتوں کے کارکنوں کا خود ستائی و پارسائی کا مغرورانہ رویہ مسلم عوام کو اپنے دین سے دور کر رہا ہے۔ ستم ظریفی تو یہ ہے کہ یہ مولانا حضرات امت کو متحارب فرقوں میں بانٹ کر ان ہی میں تفرقہ ختم کرنے کے لیے روز بروز آپس میں ملتے بھی رہتے ہیں۔ شاید ہمارے ایسے ہی زعما کے لیے ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ جن کے دلوں میں کجی ہوتی ہے ان کو گمراہ کرنے کے لیے میری یہ کتاب ہی کافی ہے (سورۃ ال عمران: 7)۔ ان دینی زعما کا ایک اور المیہ یہ ہے کہ وہ جو کہتے ہیں، وہ کرتے نہیں (سورۃ الصّف: 2) اور عوام

سے جھوٹے وعدے فرما کے اپنے آپ کو اور اپنے دین کو بدنام کرتے ہیں۔ اسلامی نظام کے قیام کے سلسلے میں وہ اہداف اور اسباب میں تمیز کرنے سے قاصر رہتے ہیں، مثلاً اس دور میں ان کی اولین توجہ ربا کے خاتمے پر مرکوز رہتی ہے حالانکہ ربا کا خاتمہ ان کئی طریقوں میں سے ایک ہے، جن کو ایک عدل ومساوات پر مبنی اسلامی معاشرہ کے قیام کے سلسلے میں بروئے کار لانا ہوگا۔

ہماری دینی جماعتوں نے پاکستان کو اس کے مقصود تک نہیں پہنچایا۔ اُن کا واحد کارنامہ قرارداد مقاصد ہے جس کی حیثیت کاغذ کے ایک ٹکڑے سے زیادہ نہیں ہے۔ دنیا میں اسلام کے مروجہ تین ماڈل کسی بھی صحیح الفکر مسلمان کو قبول نہیں ہیں اور یہ ماڈل ہیں: (۱) طالبان کا ماڈل (۲) ایران کا ماڈل اور (۳) سعودی عرب کا ماڈل۔ ترکی اور ملیشیا کے ماڈلز سیکولر ہیں، اسلامی نہیں۔ بہرحال اگر ہم اسلام کو رائج نہیں کر سکتے تو کم از کم اپنے ملکوں میں کامیاب حکومتیں تو قائم کر لیں۔

اسلام کا مقصد ایک ایسا معاشرہ کی تشکیل ہے جس کے تحت انسان کو اللہ تعالیٰ کے سوا اور کسی کا خوف نہ رہے اور اللہ کے سوا اسے کسی اور کے سامنے ہاتھ پھیلانے کی حاجت نہ ہو اور وہ جب حصول رزق کے لیے اپنے گھر سے نکلے تو اس کی اپنی اہلیت وقابلیت کے سوا کوئی اور رکاوٹ اس کے راستے میں حائل نہ ہو۔ اگر اس میں کوئی کمی من جانب اللہ ہو تو ریاست کا نظام احسان وہ کمی پوری کر دے۔ معاشرتی ومعاشی نظام ایسا ہو کہ اسے تعلق باللہ کی نشو ونما کے لیے بھی فراغت مل جائے، جس کی برکت سے اس میں فقط اپنے حقوق کی بجائے، اپنے فرائض اور دوسروں کے حقوق کا شعور اجاگر ہو جائے۔

اسلام زمین کے ساتھ انسان کے تعلق کو اتنا اجاگر نہیں کرتا کہ اللہ سبحانہ تعالیٰ کے ساتھ اس کا تعلق ماند پڑ جائے اور وہ دنیا کا ہی ہو کے رہ جائے۔ اسلام رنگ ونسل وزبان اور وطنیت کی نفی کر کے توحید کی بناء پر ایک روحانی الذہن قوم کی تشکیل کا خواہاں ہے۔ اسلام زمین اور خون کے رشتوں کی بجائے انسانی وحدت کو ایک مشترکہ نصب العین، عالمگیر اخوت انسانی اور احترام آدمیت کے اصولوں پر استوار کرنا چاہتا ہے۔ حدیث نبویؐ شریف ہے: ''الخلق عیال اللہ''۔

اسلامی نظام کے اہداف اور ہماری روزمرہ کی زندگی کے درمیان خلیج بہت ہی وسیع ہے۔ نظریاتی دینداری کے پیچھے بھاگتے ہوئے ہم مسلم ہندوستان کی شاندار تاریخ سے کٹ کر بے راہ رو ہو گئے ہیں۔ بنیاد پرست علماء ایسے متن پرست، کٹر اور مجرد اسلام کی تعلیم دیتے ہیں، جس کا کوئی تاریخی پس منظر نہیں۔ نظریاتی نعرہ بازی ہمارے جذبات کو ابھار دیتی ہے، جن کو ہمارا عمومی اخلاق سنبھال نہیں سکتا اور ہمارے نعرے تعمیر کی بجائے تخریب کا باعث بن جاتے ہیں۔

اسلام مادہ پرستی کی بجائے انسانی زندگی کی بنیاد روحانیت، تعلق باللہ اور تقویٰ پر رکھتا ہے اور وہ چاہتا ہے کہ انسان پھلے پھولے تو زمین پر مگر اس کی جڑیں آسمان پر ہوں۔ اسلام کا مرکزی سوال یہ ہے کہ انسان کو زمین کی محبت اور مادہ پرستی سے کیسے آزاد کیا جائے؟ آج کے دور کی بے لگام مادہ پرستی کی وجہ سے انسان کے تین بنیادی تعلقات مسخ ہو کے رہ گئے ہیں اور یہ ہیں بندے اور اللہ کے درمیان تعلق، انسان اور انسان کے درمیان تعلق اور انسان اور ماحولیات کے درمیان تعلق۔ عموماً ہم ان حیات بخش تعلقات میں اپنے پورے من وتن کے ساتھ داخل نہیں ہوتے بلکہ اپنی ذات کی ایک کسر کے ساتھ ہی یہ مقدس رشتے استوار کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہماری اس مجہول کوشش کی وجہ سے ہمارا اللہ کے ساتھ رشتہ جزوی، انسان کے ساتھ رشتہ مطلبی اور ماحول کے ساتھ استحصالی ہو کے رہ جاتا ہے۔

ائمہ وخطبا کی مشکلات، مسائل اور ذمہ داریاں

الشریعہ اکادمی گوجرانوالہ کے زیر اہتمام سیمینار-۲

مولانا عبدالواحد رسول نگری (مدرس مدرسہ اشرف العلوم، گوجرانوالہ)

نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم، امابعد!

انتہائی لائق احترام علماء کرام، ائمہ کرام! آج کی اس مبارک نشست میں بڑے قیمتی بیانات آپ سماعت فرما چکے ہیں۔ عنوان ہے ''ائمہ اور خطبا کی ذمہ داریاں اور مشکلات''۔

محترم دوستو! امام اور خطیب کی ذمہ داری سمجھنے سے پہلے ہمیں اس اہم نکتے کی طرف بھی توجہ دینی ہے کہ امام اور خطیب کا تعارف مسجد کی مناسبت سے ہوتا ہے اور اس کی تمام تر ذمہ داریاں بھی مسجد کے عنوان سے ہیں۔ خود مسجد اسلامی تعلیمات کی روشنی میں کیا مقام رکھتی ہے اور اسلامی سوسائٹی میں کیا مقام رکھتی ہے اور اسلامی سوسائٹی میں مسجد مسلمانوں کی کن کن ضروریات کو پورا کر سکتی ہے؟ جب مسجد کی وہ حیثیت جس سے ہم فائدہ اٹھا سکتے ہیں، سامنے آئے گی تو مسجد کی مناسبت سے امام اور خطیب کا بھی تعارف ہے، وہ بھی سامنے آئے گا۔

مسلمانوں کی چار اہم ترین ضروریات ہیں جو مسجد سے پوری ہوتی ہیں۔ پہلی ضرورت یہ ہے کہ ہر مسلمان کو ایک عبادت گاہ چاہیے۔ دوسری ضرورت یہ ہے کہ ہر مسلمان کو اسلامی زندگی گزارنے کے لیے ایک درس گاہ چاہیے جہاں سے وہ اپنی روزمرہ زندگی میں علمی طور پر رہنمائی لے سکے۔ تیسری چیز یہ کہ ہر مسلمان کو اپنے کردار، احوال اور قلب کی اصلاح کے لیے کوئی تربیت گاہ چاہیے اور چوتھی چیز مسلمانوں کے پاس ایک ایسا ادارہ ہو جہاں وہ باہم ملاقات کر سکیں، بہت قریب ہو کر ملیں، ایک دوسرے کو دیکھ سکیں، ایک دوسرے کے پاس بیٹھ سکیں، کھڑے ہو سکیں۔ یہ چار چیزیں مجموعی طور پر ہماری ضرورت ہیں۔ عبادت گاہ کا وجود، درس گاہ، تربیت گاہ، باہمی رابطے اور ملاقات کا ادارہ۔ غور کریں تو مسجد کو اللہ پاک نے ان چیزوں کا مرکز بنایا ہے اور مسجد کا امام وخطیب ان چاروں چیزوں کا نگران اور ذمہ دار ہے۔ امام وخطیب کی ذمہ داریوں میں سب سے پہلی چیز اس حوالے سے کہ مسجد عبادت گاہ ہے، یہ شامل ہے کہ ہر وقت عبادت کا اہتمام کرے، لوگوں کو عبادت کی ادائیگی میں سہولیات فراہم کرے۔ اوقات نماز، اذان وغیرہ امام ان کو اپنی ذمہ داریوں میں لے۔ یہ معنی نہیں کہ خود وہ اذانیں دے بلکہ یہ کہ بروقت اذان ہو رہی ہے، جماعت ہو رہی ہے، اس کا دھیان رکھے۔ ایسے ہی امام کی ذمہ داریوں میں عبادت کی ادائیگی کے وقت، نمازیوں پر دھیان رکھنا کہ ان کی صفیں

درست ہیں، صفوں کے اندر کوئی خلل تو نہیں اور آج کل ایک اور چیز کی طرف توجہ دلانا بھی امام کی ذمہ داریوں میں آ چکا ہے۔ جب کوئی نمازی نماز کے لیے مسجد میں آتا ہے تو تقریباً ہر نمازی کی جیب میں موبائل فون بھی ہوتا ہے۔ اس بات کی طرف توجہ دلانی چاہیے کہ فون کو بند کر لیا جائے تاکہ عبادت کی ادائیگی میں کوئی خلل واقع نہ ہو۔ امام چونکہ عبادت کا نگران بھی ہے، اس کی ذمہ داریوں میں یہ بات بھی شامل ہے کہ عبادت کی ادائیگی میں نمازیوں کا لحاظ کرے۔ جیسے حدیث مبارکہ میں تخفیف قراءت کا تذکرہ ہے کہ اس کے پیچھے نماز پڑھنے والوں میں، بیمار ہیں، مسافر ہیں، کمزور ہیں، ضعیف ہیں۔ امام صرف اپنے ذوق عبادت کو سامنے رکھ کر امامت نہ کرائے۔

یہ تو ذمہ داریاں ہیں جن کا تعلق اس بات سے ہے کہ مسجد عبادت گاہ ہے۔ مسجد کا خطیب جمعہ کی خطابت کے لیے وقت مقررہ کا ضرور لحاظ رکھے۔ ہماری کوتاہیوں میں سے ایک کوتاہی یہ بھی ہے کہ ہم جو وقت لوگوں کو بتا دیتے ہیں، اس وقت پر عبادت کا اہتمام نہیں کرتے۔ لوگوں میں چہ میگوئیاں شروع ہو جاتی ہیں اور ہمارے دل میں بات آتی ہے کہ دو منٹ اور بات کر لیں، شاید لوگوں کے دل میں دین کی اور باتیں بھی آ جائیں۔ میرے بھائیو! لوگ وقت مقررہ سے ایک سیکنڈ بھی اوپر ہو جائے تو اس کو بوجھ سمجھتے ہیں۔

مسجد کا ایک تعارف اس حوالے سے ہے کہ مسجد مسلمانوں کی درس گاہ ہے۔ حضور نبی کریم ﷺ کے مبارک زمانہ میں مسجد نبوی میں مسلمانوں کی درس گاہ کا کردار ادا کیا گیا۔ آج بھی مسلمانوں کی بنیادی دینی تعلیم کی ضروریات مسجد ہی سے پوری ہو رہی ہیں۔ مثلاً ہر مسلم گھرانے کی سب سے پہلی ضرورت یہ ہے کہ ان کے بچے کم از کم ناظرہ تو پڑھ سکیں، لہٰذا اسی بنیاد پر مسجد دیہات کی ہو یا شہر کی، کینٹ کی ہو یا ڈیفنس کی، وہاں اس بنیادی ضرورت کا ضرور اہتمام ہوتا ہے، لیکن اس سے آگے بڑھ کر روزمرہ زندگی کے تمام شعبہ جات میں دینی، علمی رہنمائی کی فراہمی بھی مسجد سے متعلق ہے۔ اگر کوئی شخص تجارت سے وابستہ ہے تو اس کی تجارت کے مسائل میں رہنمائی، کوئی شخص زراعت سے وابستہ ہے تو اس کی اس میں رہنمائی، کوئی شخص کسب یعنی محنت مزدوری سے وابستہ ہے تو اس کی اس میں رہنمائی، پھر گھریلو احکام و مسائل طلاق، نکاح وغیرہ اور اس کے علاوہ بے شمار مسائل ہیں۔ یہ سارے کے سارے مسائل مسجد کے منبر و محراب سے پورے ہوں گے۔ بالخصوص آج کے زمانہ میں اس کی ضرورت اور بڑھ گئی ہے۔ جب مسجد منبر و محراب سے یہ ضرورت پوری ہوتی نظر نہیں آ رہی تو وہ ٹی وی چینلوں کی طرف رجوع کرنے لگے ہیں اور ٹی وی چینلوں کے سامنے بیٹھے ہوئے دانش وروں سے اپنے خوابوں کی تعبیر پوچھنے لگے ہیں۔ وہ اپنے استخارے، مسائل اور دیگر لغویات کے لیے امام وخطیب کی طرف رجوع کرنے کی بجائے کسی کی اور طرف کر بیٹھے۔ وہ کیوں گئے؟ یہ ایک الگ عنوان ہے۔ ان میں ایک کوتاہی میری اور آپ کی ہے کہ ہمارا مطالعہ بہت قلیل ہے۔ ہم صحیح طریقے سے ان کی رہنمائی کر ہی نہیں سکتے۔ آدمی نے روزہ رکھا ہے تو کن چیزوں سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے، نماز پڑھ رہے ہیں تو دوران نماز میں کن چیزوں سے نماز فاسد ہو جاتی ہے۔ اگر میں اور آپ یہ مسائل بتلا نہیں سکتے تو کم از کم بتلانے والوں کی ضرورت اور اہمیت تو ان کے دلوں میں بٹھا سکتے ہیں کہ بھائی آپ ان شعبوں میں لگے ہیں، اس شعبہ کے مسائل جاننے کے لیے آپ مدرسہ نصرت العلوم چلے جائیں، مظاہر العلوم چلے جائیں، دار العلوم چلے جائیں، کسی مدرسے کی طرف رجوع کریں۔

ایک کوتاہی ہماری یہ ہوتی ہے کہ ہمارا رویہ بہت سخت ہوتا ہے۔ ایک نوجوان کے دل میں بہت سے سوالات کھڑے ہو سکتے ہیں۔ دین کے حوالے سے وہ غلط فہمی کا شکار ہو سکتا ہے۔ کوئی زہریلا مواد اس کے دل میں اشکال پیدا کر سکتا ہے۔ وہ اشکال انتہائی سنگین ہو سکتا ہے۔ اب اگر وہ اپنے ذہن میں اٹھنے والے سوال کو امام کے سامنے عرض کرتا ہے تو فوراً ہماری طرف سے سخت ترین جملہ اس کی طرف جائے گا: تو تو دہریہ ہو رہا ہے، تو تو بد دین ہو رہا ہے۔ اس کو کچھ کہنے دیں، اس کی زبان کی بات دل پر آنے دیجیے۔ وہ آئے گی اور اس کی فکر اس کی سوچ کا اندازہ ہوگا تو ہم اس کی رہنمائی کریں گے۔

ایک اور بات اسی مناسبت سے کہ مسجد درس گاہ ہے اور لوگوں کی علمی رہنمائی کا مؤثر ادارہ ہے، یہ بھی عرض کر دوں کہ ایک امام وخطیب یہ دیکھے کہ میری یہ مسجد آئینی، قانونی اور دستوری طور پر جس مسلک سے وابستہ ہے اور یہاں کے نمازی جس مسجد سے وابستہ ہیں، اگر ان نمازیوں کو اپنے مسلک پر عمل کرتے ہوئے کوئی بات پوچھنے کی نوبت آ جاتی ہے، مثلاً کوئی آدمی کسی دوسرے مسلک کی مسجد میں چلا گیا اور وہاں کسی نے کوئی بات ذہن میں ڈال دی تو اس کی ٹھیک ٹھاک علمی رہنمائی کی جائے۔ مثال کے طور پر میں حنفی المسلک ہوں۔ میرے نمازی بھی حنفی المسلک ہیں۔ یہاں کوئی دوسرے مسلک کا آدمی آ جائے تو وہ اونچی آواز میں آمین کہہ دیتا ہے اور لوگ اس کو ڈانٹیں تو وہ دو چار حدیثیں سنا دیتا ہے۔ اب لوگ لامحالہ طور پر امام صاحب کی طرف رجوع کریں گے کہ یہ کیا کہہ رہا ہے تو امام صاحب کو ایسے میں کم از کم اپنے مسلک کی علمی بنیاد انتہائی مضبوط رکھنی چاہیے اور وہ خود بھی اس کے لیے تیار رہے۔ مسجد کے ساتھ ایک لائبریری کا انتظام بھی ہونا چاہیے۔

میرے بھائیو! باتیں تو بہت زیادہ ہیں۔ میں نے دو حیثیتوں کے حوالے سے بات کی ہے۔ ایک تو یہ کہ مسجد عبادت گاہ ہے، میری اس حوالے سے کیا ذمہ داری ہے۔ دوسری مسجد درس گاہ ہے، میری اس حوالے سے کیا ذمہ داری ہے۔ اس ذمہ داری کے اندر یہ شامل ہے کہ لوگ جو مسجد سے علم حاصل کریں گے، اس کے مختلف درجے ہیں۔ ایک درجہ تو یہ ہے کہ باضابطہ وہ درس گاہ کے اندر آ کر پڑھیں۔ یہ بہت محدود درجہ ہے، بہت محدود لوگ آئیں گے۔ ترجمۃ القرآن کی کلاس لگ گئی، بہت لوگ آئے۔ عام لوگوں کو زیادہ سے زیادہ علمی معلومات فراہم کرنے کے لیے درس قرآن اور درس حدیث کا انتظام ہونا چاہیے اور پھر اس سے بھی وسیع دائرہ ہے اور وہ جمعۃ المبارک۔ ہماری ترجمہ کلاس میں تھوڑے لوگ ہوں گے، جمعہ میں زیادہ ہوں گے۔ درس سے زیادہ لوگ جمعہ کے موقع پر آئیں گے۔ جمعہ کی نماز میں خطبہ میں ہمارا بیان مضبوط علمی بنیادوں پر ہونا چاہیے۔ کوئی وقت تھا کہ لمبی تقریر کرنے والے شخص کی خطابت کا چرچا اور شہرت ہوتی تھی۔ ساری ساری رات تقریر چلتی تھی۔ آج معیار بدل چکا ہے۔ لوگوں کے پاس مختصر وقت ہے، اس مختصر وقت میں اپنی بات لوگوں کو سنائیں۔ ایک وقت تھا کہ ایک خطیب الفاظ کے انتہائی نادر نمونوں کا ذخیرہ رکھتا تھا۔ تقریر میں ایک لفظ آ گیا تو دوبارہ نہ آئے۔ لوگ اس کا معنی مفہوم سمجھنے کے لیے لغت کی کتابیں دیکھتے رہیں۔ لیکن آج یہ معیار بدل چکا ہے۔ انتہائی سادہ لب ولہجہ اور لوگوں کی سطح کے مطابق گفتگو کی جائے۔ لفظوں کی بادشاہت وہاں نہ ہو بلکہ جتنے گمراہ لوگ ہیں جنھوں نے لوگوں کو گمراہ کیا، انہوں نے طرز گفتگو انتہائی سادہ رکھا ہے۔ طرز گفتگو خطیب کا انتہائی سادہ ہو۔

تیسری چیز یہ کہ کوئی وقت تھا کہ لوگوں کی معلومات کا مکمل مرکز وہ خطیب کی خطابت ہوتی تھی۔ مولانا صاحب نے جو بیان فرما دیا، وہی ان کا دین ہے اور وہی ان کی شریعت ہے۔ لیکن معاف کرنا، آج لوگوں کی معلومات کے ذرائع بڑھ چکے ہیں۔ آج کسی عنوان پر بات شروع کریں تو لوگ فوراً کہہ دیں گے کہ یہ بات میں نے فلاں جگہ پر پڑھی ہے۔ آج نیٹ کی سہولت ہر نوجوان کے پاس ہے، کمپیوٹر، بڑی سے بڑی لائبریری ایک پرزے کے اندر جمع ہے اور وہ منٹوں میں اسے دیکھ لیتے ہیں، اس لیے میں اور آپ مجمع کے سامنے تقریر کرتے ہوئے انتہائی احتیاط سے کام لیں کہ لوگوں کی معلومات کا انحصار اب صرف میری خطابت پر نہیں بلکہ خارجی ذرائع پر ہے۔

تو خلاصہ یہ ہے کہ مسجد درس گاہ ہے، علم کا مرکز ہے، خطیب اور امام کی ذمہ داری ہے کہ لوگوں کی اس دائرے میں بھرپور رہنمائی کریں۔ مسجد باہمی ملاقات اور رابطے کا ادارہ ہے، امام یہاں کن کن طریقوں سے لوگوں سے رابطہ کرے، کیسے لوگوں کو جوڑے، یہ ان کی ذمہ داریاں ہیں اور ان ذمہ داریوں کو ادا کرنے میں کیا ذمہ داریاں ہیں، میرے خیال میں ان مشکلات کو تفصیل کے ساتھ لانا ضروری نہیں۔ واخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

مولانا عبدالرؤف فاروقی (مہتمم جامعہ اسلامیہ، کامونکی)

الحمد للہ و کفی و سلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ

محترم علماء کرام اور میری تمام برادری کے دوستو! آپ حضرات نے آج کے موضوع کی مناسبت سے بڑی فکر انگیز گفتگو علماء کرام سے سنی ہے۔ یہ بہت طویل موضوع ہے اور اس پر تقاریر نہیں، کئی دنوں تک بیٹھ کر تبادلہ خیال ہونا چاہیے۔ مشکلات سامنے آئیں، مسائل سامنے آئیں، ذمہ داریوں پر گفتگو ہو، مسائل ومشکلات کو حل کرنے کی تجاویز سامنے لائی جائیں۔

۱۹۷۳ء میں، میں باقاعدہ امامت کے مصلے پر کھڑا ہوا۔ جس مسجد میں مجھے امامت کی ذمہ داریاں سونپی گئی، اس مسجد میں، میں واحد خدمت کرنے والا تھا یعنی غسل خانہ کی صفائی، وضو کی جگہ کو دھونا، موٹر چلانا، پانی کا انتظام کرنا، یہ سب میری ذمہ داریاں تھیں۔ پہلے پوری مسجد کی صفائی کرنا، صفیں درست کرنا، اذان کے ٹائم پر اذان دینا، پھر قراقلی ٹوپی پہن کر منبر پر کھڑے ہو جانا یا بیٹھ جانا، میری ابتدا یہاں سے ہوئی۔ ایک ڈیرے اور گاؤں کا امام ہے، اس کے مسائل کیا ہیں۔ ایک قصبے اور شہر کا امام ہے، اس کے مسائل کیا ہیں۔ پھر شہروں اور قصبوں میں ایک شخصی مسجد ہے کہ ایک شخص نے بنائی ہے، وہی اس کا منتظم ہے، وہی اس کا متولی ہے، اسی کا قاعدہ کلیہ چلتا ہے، اس مسجد کے امام کے کیا مسائل ہیں۔ محلے کی مساجد کی منتظمہ ہے، محلے کی کمیٹی بنی ہوتی ہے جس میں کوئی دودھ بیچنے والا، سودی کاروبار کرنے والا، اس طرح کے لوگ اس کمیٹی کے منتظم اور صدر، نائب صدر، خزانچی وغیرہ ہوتے ہیں، وہاں کے امام کے مسائل کیا ہیں۔ پھر اوقاف کی سرکاری مساجد کے ائمہ ہیں، ان کے مسائل ہیں۔ بہت سی قسمیں ہیں اماموں کی۔

میری اپنی رائے یہ ہے کہ ذمہ داریاں تو سب جگہ کی ایک جیسی ہیں۔ ایک بڑے عالم کے پاس شیخ الحدیث کے پاس بہت سے اماموں کے مسائل آتے ہیں۔ یہاں مولانا زاہد الراشدی صاحب تشریف فرما ہیں، ان کے پاس بھی

بہت سے ائمہ کے کیس، مقدمات آتے رہے، یہ نبھاتے رہے۔ ہم وکیل صفائی ہوتے ہیں اماموں کے۔ مولوی کی وکالت کرنا، اس کے اوپر لگے ہوئے الزامات کو دھونا یہ ہماری فطرت میں شامل ہے۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ اس سیمینار کے انعقاد پر مولانا زاہد الراشدی صاحب مبارکباد کے مستحق ہیں، لیکن سیمینار کی بجائے اگر ایک جرگہ بنایا جاتا اور وہاں پر دیہاتوں کے امہ کو بھی دعوت دی جاتی اور ان سے بھی کہتے کہ تم اپنے مسائل بتاؤ، ہم اپنے بتاتے ہیں۔ اس طرح ہم خیالات کا تبادلہ کر سکتے ہیں۔ وقت کی بہت قلت ہے اور مسائل بہت زیادہ ہیں اور بہت سے مسائل جن سے ہمیں واسطہ پڑتا ہے، اس پر بہت لمبے عرصے کے لیے گفتگو کی ضرورت ہے۔ میں امید کرتا ہوں کہ الشریعہ اکیڈمی کبھی اس کا بھی اہتمام کرے گی کہ ہم مل کر بیٹھیں گے اور آپس میں تبادلہ خیال کریں گے۔ مسائل ہر کسی کے مختلف ہیں۔ ہم جیسے لوگ مسائل میں گھرے ہوئے ہیں اور مولانا سمیع اللہ فراز جیسے لوگ ہم پر طنز کر سکتے ہیں کہ ہم یہ نہیں کر سکے، وہ نہیں کر سکے۔ جب ہم سب مل کر بیٹھیں گے، تبھی ہم لوگ مسائل کو حل کر سکیں گے۔

میں اپنی بات ختم کرتے ہوئے عرض کرتا ہوں کہ ذمہ داریوں کا انداز بالکل ایک ہے، امام اور خطیب کی ذمہ داریوں کا دائرہ متعین ہے کیونکہ امام اور خطیب روحانی باپ ہوتا ہے اپنے تمام متوسلین کا، اپنے نمازیوں کا اور اسے اپنے نمازیوں، مقتدیوں اور اپنے سامنے بیٹھ کر سننے والے لوگوں کے ساتھ بالکل باپ جیسی شفقت سے پیش آنا چاہیے۔ آپ دیکھیں، عیسائی اپنے مذہبی رہنما کو فادر کہتے ہیں یا پادری کہتے ہیں۔ پدر بھی فارسی میں باپ کو کہتے ہیں۔ جیسے وہ پادری نہ صرف اپنے مذہب کے لوگوں کے ساتھ بلکہ ہمارے مذہب کے غریب لوگوں، دیہات کے لوگوں اور بہت سے مجبور لوگوں کے ساتھ انتہائی شفقت کا معاملہ کرتا ہے، حالانکہ ان کے پاس مذہب کی سچائی نہیں ہے، لیکن وہ پھر بھی اپنے اخلاقی رویے کی وجہ سے لوگوں میں مقبول ہو جاتا ہے، اسی طرح ایک امام اور خطیب کو لوگوں کے ساتھ شفقت کا معاملہ کرنا چاہیے۔

میں یہ سمجھتا ہوں کہ مسائل بہت ہیں، ذمہ داری کا دائرہ متعین ہے، لیکن حل ایک ہی ہے کہ ہر امام اور ہر خطیب انما یخشی اللہ من عبادہ العلماء اور العلماء ورثۃ الانبیاء کا نمونہ بن جائے۔ دین نبی کریم کی وراثت ہے، انبیا کی وراثت ہے اور دین صرف عبادات کے شعبے کا نام نہیں ہے۔ امور سیاست، سیاست مدنی جسے ہم سیاسی امور کہتے ہیں جس سے ہم نے اپنے آپ کو بے دخل کر لیا ہے، یہ سب سردار دو عالم لی اللہ علیہ وسلم کی وراثت ہے اور امام اور خطیب کو جہاں عبادت اور سیاست دونوں میدانوں کا شہسوار ہونا چاہیے، وہاں خشیت الٰہی سے اس کا دل بھرا ہوا ہونا چاہیے۔ حضرت مولانا زاہد الراشدی صاحب تشریف فرما ہیں، آپ حضرات اختلاف کر سکتے ہیں، آج سے پچیس تیس سال پہلے جب دیوبندی علما سیاست سے وابستہ تھے، ہر مسجد کا امام اور خطیب سیاسی ہوتا تھا۔ جمعیت علما اسلام اوپر سے لے کر نیچے تک مضبوط تھی۔ اس وقت مسائل کم ہوتے تھے۔ جس دن ہم نے پسپائی اختیار کی ہے، مسجدوں کا انتظام مقامی کمیٹیوں کے سپرد کر دیا ہے جس میں ایک بریلوی ہوتا ہے، ایک غیر مقلد ہوتا ہے، ایک جماعت اسلامی کا، ایک پیپلز پارٹی کا آدمی ہوتا ہے، ایک تحریک انصاف کا ہوتا ہے، یوں مختلف خیالات کے لوگوں کا مرکب یعنی مغلوبہ سا ہوتا ہے اور آپ جانتے ہیں کہ نتیجہ تو بہر حال اقل اور ارذل کے تابع ہوتا ہے اور یہ کمیٹیاں ایک سازش کے تحت بنی

ہیں۔ جمعیت علماء اسلام نے، دیوبندی مولوی نے ۱۹۷۰ء کی دہائی میں یا اس سے پہلے یا اس کے بعد بہت سی قوتوں کو شکست دی اور اس بری طرح دی کہ وہ آج تک اپنے زخم چاٹ رہے ہیں۔ سازش تیار ہوئی کہ اس ملا کو کسی طرح پابند کر دیا جائے اور پابند کرنے کے لیے یہ سارا نظام بنایا گیا۔ آج ہم خشیت الٰہی سے اتقوا اللہ حق تقاتہ (اللہ سے ڈرو جس طرح اس سے ڈرنے کا حق ہے) اور ڈرنے کا حق کیا ہے کہ صرف اللہ سے ڈرو، اس کے سوا کسی سے نہ ڈرو اور ہمارا حق ہے تنقید کرنا حکمرانوں پر، ہمارا حق ہے تعاونوا علی البر والتقوی کی بنیاد پر سیاست کرنا اور کسی کو کوئی حق نہیں ہے کہ اس ملک پر جو اسلامی جمہوریہ پاکستان ہے۔ اے این پی کو حق نہیں ہے، پیپلز پارٹی کو، مسلم لیگ ن کو حق نہیں ہے کہ وہ سیاست کرے اس لیے کہ قرارداد پاکستان کی بنیاد پر اس کا قبلہ متعین ہے۔ اسلام اس کا ریاستی مذہب ہے تو کون حق دار ہے کہ وہ سیاست کر سکے؟ وہ صرف ملا اور مولوی اور پیغمبر دو عالم کا وارث ہے۔ اگر ہم اس پر آ جائیں تو مسائل ایک دم نہ سہی، ایک ایک کر کے حل ہوتے جائیں گے۔ میں اپنی گفتگو کا خلاصہ دو لفظوں میں بیان کرتا ہوں کہ ذمہ داریاں سب کی متعین ہیں، دائرہ واضح ہے، پیغمبر دو عالم اور صحابہ کرام ہمارے سامنے نمونہ ہیں۔ ہم سب اللہ سے ڈرنے کا نمونہ بن جائیں تو ان شاء اللہ مسائل حل ہو جائیں گے، مشکلات ختم ہو جائیں گی۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس مقام پر واپس آنے کی توفیق عطا فرمائے۔ واخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

مولانا حافظ گلزار احمد آزاد (جمعیت اہل سنت، گوجرانوالہ)

عنوان کے حوالے سے یہ پروگرام ایک الگ اور منفرد سا پروگرام سے ہے۔ عموماً ہمارے ہاں اس قسم کے موضوعات پر پروگرام نہیں ہوتے۔ ذمہ داریوں کے حوالے سے پہلی نشست میں، میں نے اور آپ نے بہت سی کام کی باتیں سنی ہیں۔ اللہ عمل کی توفیق دے اور جن سے بچنا ہے، ان سے بچنے کی توفیق دے۔ علماء کی ذمہ داریاں معاشرے کے حوالے سے، اسلامی سوسائٹی کے حوالے سے، خطابت کے حوالے سے، مسجد کے حوالے سے ہم نے پوری کرنی ہیں۔ علماء کے مسائل بھی بے پناہ ہیں۔ ایک ایک مسئلہ آپ دیکھیں کہ اس میں سے کتنے مسائل نکلتے ہیں۔ کیا کیا مجبوریاں اور دشواریاں ہیں، آپ مجھ سے بہتر جانتے ہیں۔ ان مسائل کو یہاں بیان بھی کیا گیا ہے، آگے ان کا حل تو وہ دور دور تک دکھائی نہیں دے رہا کہ ائمہ کے مسائل ہم کس حد تک حل کر پائیں گے یا واقعتاً ان مسائل کو حل کرنے کے لیے ہمارے پاس وسائل ہیں یا ہم سنجیدہ کوشش کرنا چاہ رہے ہیں۔ ابھی تو اس بات کا بھی یقین نہیں آ رہا، کیوں کہ مختلف عنوانات پر پروگرام ہوتے ہیں، سیمینار ہوتے ہیں اور کہتے ہیں کہ بھائی نیا پروگرام تھا بڑا اچھا ہوا، لیکن عملی پیش رفت ہوتی نظر نہیں آتی۔ ایک مزید رکاوٹ ہے کہ ہمارے ہاں ایسے منفی طرز عمل پر کسی کو توڑنے کے لیے پروگرام ہوتے ہیں، لیکن مثبت اور معیاری عنوانات پر معاشرے کے مسائل کو اجاگر کرنے کے لیے کوئی کام نہیں ہوتا۔ اس حوالے سے میں الشریعہ اکادمی کے اراکین کو مبارکباد اور خراج تحسین پیش کرتا ہوں کہ وہ ایسے پروگرام کے لیے بہت کوشش اور جدوجہد کر رہے ہیں۔ ان شاء اللہ جیسے جیسے آگے چلتے جائیں گے، پیش رفت ہوتی جائے گی۔

ذمہ داریوں کے حوالے سے میں مختصر سا بیان کروں گا کیوں کہ اتنا وقت نہیں ہے۔ ۷۰ء سے پہلے سے میں گوجرانوالہ میں ہوں اور جمعیت اہل سنت والجماعت سے منسلک ہوں اور یہ علما سے تعلق کی وجہ سے ہے۔ میں آج

بڑے اعتماد سے کہتا ہوں کہ ہمارے عام ائمہ کرام اور خطبا میں محلوں کے اندر جن کو ہم عام زبان میں چھوٹے مولوی کہتے ہیں، جتنی قربانی ہمارے مسلک کے علما دیتے ہیں، آپ کو اتنی قربانی کہیں نہیں ملے گی۔ جتنے مسائل کے اندر رہ کر وہ دین کا یہ سلسلہ چلاتے ہیں، آپ کو مثال ملنا مشکل ہوگا۔ جوں جوں آپ ان پر غور کرتے جائیں گے، آپ کو مسائل کھلتے ہوئے نظر آئیں گے۔ وجہ کیا ہے کہ تین ہزار روپے امام صاحب لے رہے ہیں، اس کے آٹھ بچے ہیں، دو میاں بیوی ہیں، والدین بھی آ گئے، وہ بھی ان کے پاس ہیں۔ اب بتائیں، یہ بجٹ کیسے بنایا جائے گا؟ ۳۵۰۰ میں یہ مہینہ کیسے چلائے گا؟ ایک آدمی کا ناشتہ نہیں چلتا، لیکن یہ لے کر پھر کام کر رہے ہیں اور کس طرح کام کر رہے ہیں، یہ وہ جانتے ہیں یا ان کا اللہ جانتا ہے۔ کیونکہ ان کے ذہن کے اندر پیشہ نہیں، مشن ہے اور وہ یہ مشن لے کر چلتے ہیں۔ ہمارے اکابر کا بھی یہ یہی ورثہ تھا کہ ایک جگہ بیٹھ کر بھوکے پیاسے رہو، لیکن نئی نسل تک ورثہ پہنچا دو۔

یہاں وزیر آباد میں واقعہ پیش آیا کہ ایک پڑھی لکھی خاتون نے ایک قادیانی سے نکاح کر لیا۔ یہاں سے سب علما گاڑیاں بھر کر گئے۔ یہاں کی انتظامیہ سے بھی بات ہوئی اور وہاں کی انتظامیہ سے بھی بات ہوئی، لیکن میں جاتے ہوئے راستے میں یہ سوچ رہا تھا کہ قادیانیوں کے خلاف بچے بچے کے دل میں نفرت ہے، پھر اس خاتون نے جو کافی پڑھی لکھی ہے، اس نے مرزائی کے ساتھ کیوں نکاح کر لیا؟ جب ہم وہاں پہنچے تو مجھے پتہ چلا کہ اس پورے گاؤں میں ایک بھی مسجد علماء دیوبند کی نہیں ہے۔ میں سمجھ گیا کہ اگر ہمارا ایک چھوٹا سا ورکر بھی یہاں اصلاح کا کام کرتا تو یہ سانحہ پیش نہ آتا۔ اور کچھ ایسے علما ہمارے ضلع کے جوان پڑھ تھے، سادہ قرآن پاک پڑھا ہوا تھا، علاقہ کے اندر انہوں نے کام کیا۔ وہ اردو مطالعہ کرتے رہے اور علما سے جڑے رہے، پورے علاقے کا نقشہ ہی بدل گیا۔ ایک گاؤں نہیں، کئی گاؤں کے اندر یہ اثر پھیلتا چلا گیا۔ اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ سب سے پہلے ہمیں اپنے آپ کو بنانا چاہیے، جب اپنے آپ کو بنا لیں گے تو پورا معاشرہ بن جائے گا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مسجد کے اندر تشریف فرما ہیں، صحابہ کرام بھی بیٹھے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ اب جو آدمی آئے گا، وہ جنتی ہوگا۔ صحابہ کرام بہت متجسس ہوئے کہ وہ کون آدمی ہے؟ اتنے میں ایک آدمی آیا۔ تازہ وضو کیے ہوئے تھا، بائیں ہاتھ میں جوتیاں پکڑے ہوئے ہے، سلام کیا اور آ کر بیٹھ گیا۔ دوسرے دن پھر مجلس جمی ہوئی تھی۔ آپ نے فرمایا کہ اب جو آدمی آئے گا، وہ جنتی ہے۔ صحابہ کرام پھر انتظار میں، جستجو میں۔ وہی آدمی اسی حالت میں آیا۔ تیسرے دن پھر اسی طرح آپ نے فرمایا کہ ابھی جو آدمی آئے گا، وہ جنتی ہوگا۔ وہ آیا، اسی طرح سلام کیا اور بیٹھ گیا۔ عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ فرماتے ہیں کہ میں نے یہ ارادہ کیا کہ آج میں اس کے پیچھے جاتا ہوں، پتہ کرتا ہوں کہ یہ کون سا کام کرتا ہے کہ اس کے بارے میں آقا نے فرمایا کہ یہ جنتی ہے۔ چنانچہ میں اس کے پیچھے گیا۔ جب ان کے گھر کے پاس گئے تو اس آدمی نے محسوس کیا کہ میرے پیچھے کوئی ہے۔ عبداللہ بن عمرو العاصؓ فرماتے ہیں کہ میں نے اس سے کہا کہ میں نے قسم کھائی ہے کہ میں تین دن اپنے گھر نہیں جاؤں گا۔ مہربانی فرما کر مجھے اپنے گھر رہنے کی اجازت دو۔ وہ آدمی کہنے لگا کہ ٹھیک ہے، رہ لو۔ حضرت عبداللہ کہتے ہیں کہ میں رات کو جاگتا رہا کہ یہ آدمی کیا کرتا ہے۔ اس آدمی نے عشاء کی نماز پڑھی، تھوڑا بہت پڑھا اور سو گیا، تہجد کے لیے اٹھا ہی نہیں، فجر کی نماز کے لیے اٹھا۔ میں تین دن رہا، لیکن ان تین دنوں میں

اس نے کوئی منفرد کام نہیں کیا۔ میں بڑا حیران ہوا کہ یہ ایسا کیا کام کرتا ہے کہ آقا نے فرمایا کہ یہ جنتی ہے۔ میں نے اس آدمی کے سامنے ساری صورت حال بیان کی تو اس نے کہا کہ سارا معاملہ تمہارے سامنے ہے۔ میں بڑا مایوس ہوا، واپس جانے لگا تو اس آدمی نے کہا کہ اے اللہ کے بندے، میں کوئی اور کام تو نہیں کرتا البتہ میرے دل میں کسی آدمی کے لیے کینہ یا بغض نہیں ہے۔ شاید یہ عمل ہی خدا پاک کو پسند آ گیا۔ حضرت عبداللہؓ کہنے لگے، میری آنکھیں کھل گئیں کہ واقعتاً یہی وہ عمل ہوگا کہ جس کی وجہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو جنت کی بشارت سنا دی ہے۔

یہ تو عام آدمی کے بارے میں ہے۔ اگر ہم علما کے بارے میں سوءظن رکھنا شروع کر دیں، حسد اور کینہ شروع کر دیں، ایک جماعت دوسری جماعت سے حسد شروع کر دے تو بہتری آ سکتی ہے؟ سب سے پہلے اگر ہم اپنے سینے کو صاف کریں، سب سے محبت کریں، جو سیاسی علما ہیں، جو جہاد کا کام کرنے والے ہیں، جو تبلیغ کا کام کرنے والے ہیں، ان کو اپنے گھر کا فرد سمجھیں، ان کو دل میں جگہ دیں تو پھر ان شاء اللہ اس کارواں کو کوئی روک نہیں سکتا۔

مساجد کی کمیٹیوں کے بارے میں بات ہوئی۔ ہم بھی کمیٹیوں کے ماتحت کام کرتے ہیں۔ مولانا راشدی صاحب نے فرمایا ہے کہ اگر امام طاقتور ہو تو کمیٹی بھاگ جاتی ہے اور اگر کمیٹی طاقتور ہو تو امام بھاگ جاتا ہے۔ مولانا کا تجربہ تو یہ ہے۔ میں چالیس سال سے امام ہوں، میں سمجھتا ہوں کہ امام طاقتور ہے۔ مولانا شمس الدین صاحب کا جنازہ تھا۔ مولانا اعظم صاحب اہل حدیث مکتب فکر کے بڑے عالم ہیں۔ وہ کہنے لگے کہ یار تم اچھے ہو، ہمیں تو کمیٹیاں ہی چلنے نہیں دیتیں۔ یعنی ان کے ذہن میں یہ ہے کہ دیوبندی کمیٹیوں کا محتاج نہیں ہے۔ یہ تو ہم ہی جانتے ہیں کہ ہمارے ساتھ کیا بیتتی ہے۔ لیکن جو مخلص ہو کر چلے، پیشہ نہ سمجھے، مشن سمجھ کر چلے گا، ایک دن آئے گا کہ کمیٹیاں ماتحت ہو جائیں گی ان شاء اللہ۔ میں تو یہ کہتا ہوں کہ یہ فیصلہ کر لو کہ کوئی مطالبہ نہیں کرنا، مجھے جو دینا ہے اللہ نے دینا ہے۔ کسی سے کوئی مطالبہ نہیں کرنا اور دوسرا یہ فیصلہ کر لیں کہ یہ سمجھیں کہ مجھے حاجی صاحب نے رکھا ہوا ہے یا صدر صاحب نے رکھا ہوا ہے، بلکہ یہ سمجھیں کہ مجھے اللہ نے رکھا ہوا ہے۔ جب یہ فیصلہ کر لیں گے تو ان شاء اللہ، اللہ راہیں کھول دے گا۔

میرا چھوٹا سا محلّہ ہے، وہاں چھوٹی سے مسجد ہے۔ اس مسجد میں، میں نے تقریر کی علامہ اقبال کے خلاف۔ اس وقت میں طالب علم تھا اور نوائے وقت کے فرنٹ پیج پر خبر آتی تھی مولانا حسین احمد مدنیؒ کے خلاف کہ یہ پاکستان کے لیے خطرہ ہیں۔ مجھے غصہ آ گیا، میں نے جمعہ کا سارا خطبہ علامہ اقبال کے خلاف کیا کہ تم اس کی بات کرتے ہو کہ جس کے منہ پر ڈاڑھی بھی نہیں تھی۔ میں نے بہت کچھ کہہ دیا، لیکن آخر میں اللہ کے فضل سے میں نے کہا کہ علامہ اقبال اگر بنا ہے تو احمد علی لاہوریؒ کی نظر سے بنا ہے، علامہ انور شاہ کاشمیریؒ کی نظر سے بنا ہے، عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کی مجلس سے بنا ہے، اس وجہ سے ہم اس کا احترام کرتے ہیں۔ جمعہ پڑھانے کے بعد ہمارے سارے دیوبندی حضرات آ گئے اور کہنے لگے کہ آپ صبح صبح چلے جائیں کہ سارا محلّہ آپ کے خلاف ہو گیا ہے، گولیاں چل جائیں گی۔ میں نے کہا کہ صبح کیا جانا ہے، میں ابھی جاتا ہوں۔ وہاں سے نکلا تو نصرت العلوم چلا گیا۔ اس وقت میں وہاں پر زیر تعلیم تھا۔ حضرات! تین دن گزرے تھے، اللہ کا کرم ایسا ہوا کہ جو میرے مخالف تھے، وہ آ گئے اور کہنے لگے کہ لوگ کہتے ہیں کہ جب تک حافظ صاحب نہیں آئیں گے، نہ اذان ہوگی نہ نماز ہوگی۔ آپ کی مہربانی واپس چلیں۔ میں نے کہا کہ آپ صوفی عبدالحمید سواتی صاحب کے پاس

آؤ، وہ جو فیصلہ کریں گے میں ماننے کو تیار ہوں۔ چنانچہ وہ صوفی صاحب کے پاس آئے۔ صوفی صاحب نے بات سنی اور فرمانے لگے کہ جاؤ بیٹا، جا کر خدمت کرو۔ یہ سب کچھ میرا کمال نہیں تھا، یہ میں نے اپنے اکابر کے حوالے سے گفتگو کی تھی۔ اگر آج ہم سب اپنا ذہن مثبت بنا کر کام کریں گے تو بہت سے مسائل کا حل ہو سکتا ہے۔

میں آخر میں بس دو باتیں کہتا ہوں کہ ہماری جتنی بھی جماعتیں ہیں، فکری ہیں، مذہبی ہیں، سیاسی ہیں، سماجی ہیں، تبلیغی ہیں، سب کا احترام کرو، سب کا ادب کرو اور دوسری بات یہ ہے کہ اللہ کو حاضر ناظر کر کے اپنے اکابر کے مشن کو آگے بڑھانے کی کوشش کرو۔ اللہ ہم سب پر کرم فرمائے گا۔ واخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

مولانا عبدالحق خان بشیر صاحب (حق چار یار اکیڈمی، گجرات)

نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم، امابعد!

معزز علماء کرام، قابل صد احترام بزرگو اور دوستو!

سب سے پہلے تو میں الشریعہ اکادمی کے منتظمین کو مبارکباد پیش کرتا ہوں کہ وہ آج کی عصری و سماجی ضروریات کے حوالے سے مختلف قسم کے سیمینار منعقد کرتے ہیں اور یہ آج کا پروگرام بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ مجھے جو موضوع دیا گیا ہے، وہ ہے ''خطبہ جمعہ کے لیے موضوع کا انتخاب اور اس کی تیاری''۔ مجھ سے پہلے میرے دوست مولانا گلزار احمد آزاد صاحب مساجد کی کمیٹیوں اور ائمہ وعلما کی مشکلات پر بات کر رہے تھے۔ اس حوالے سے والد محترم امام اہل سنت مولانا سرفراز خان صفدرؒ دو باتیں ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ مسجد کی کمیٹی کے اندر موجود سرمایہ دار چاہے اس کی پیشانی پر تہجد کے اور سجدوں کے نشانات اور محراب پڑ جائے، وہ مولوی کے معاملے میں سرمایہ دار ہی ہے۔ دوسری بات حضرت شیخ فرمایا کرتے تھے کہ اللہ رب العزت نے مولوی کو لوگوں کی اصلاح کے لیے بھیجا ہے اور ہر مسجد میں ایک بابا مولوی کی اصلاح کے لیے ہوتا ہے۔ شیخ فرمایا کرتے تھے کہ جو مولوی اللہ کی رضا کے لیے اس بابے کو برداشت کر جائے اور اپنے مشن کو اس کی وجہ سے ترک نہ کرے، میں اسے جنت کی ضمانت دیتا ہوں۔ محض اللہ کی رضا کے لیے اس بابے کو برداشت کر جائے۔

اب میں اپنے موضوع کی طرف واپس آتا ہوں۔ خطابت ایک فن ہے جس کی ہر دور میں اہمیت رہی ہے اور اس فن نے معاشرے کے اندر انفرادی اور اجتماعی اصلاح میں بڑا کردار ادا کیا ہے۔ اس فن سے تحریکیں اٹھی ہیں، تحریکوں کو عروج ملا ہے، تحریکیں کامیاب ہوئی ہیں۔ لیکن یہ فن اس وقت تک اہمیت کا حامل بھی رہا ہے، اس کا ایک کردار بھی رہا ہے جب تک یہ فن سوسائٹی کی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ جب یہ فن ایک سوسائٹی کی بجائے ایک خطیب کی ضرورت بن گیا، اس وقت سے یہ فن اپنی اہمیت کھو گیا ہے۔ یہ فن دراصل سوسائٹی کی ضرورت کے لیے ہے، اس نے ہر دور کے اندر سوسائٹی کی اصلاح میں بنیادی کردار ادا کیے ہیں۔ آج ہمیں یہ شکوہ ہے کہ جمعہ کے موقع پر ہماری مساجد کے اندر نفری کم کیوں ہو گئی ہے یا جو نفری ہے، وہ تقریر کے ٹائم کی بجائے خطبے کے ٹائم پر یا نماز کے ٹائم پر کیوں آتی ہے۔ یہ شکوہ تو ہم کرتے ہیں، لیکن کیا کبھی ہم نے یہ سوچا منبر پر بیٹھ کر ہم ان لوگوں کی ضرورت کو پورا کر رہے ہیں؟ سوسائٹی کے جو مسائل ہیں، سماج کی جو ضروریات ہیں، کیا ہم منبر پر بیٹھ کر ان ضروریات کو پورا کر رہے ہیں؟ آج

خطابت صرف اور صرف نقالی اور رٹے کا نام رہ گئی ہے اور میں بطور لطیفہ عرض کرتا ہوں کہ ہمارے علاقے کے بڑے ممتاز خطیب ہیں، تقریر فرما رہے تھے اور میں ان کی تقریر سے اندازہ کر رہا تھا کہ یہ تقریر حضرت مولانا عبدالشکور دین پوریؒ کی ہے۔ تقریر میں فرما رہے تھے کہ میں نے امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ سے ملاقات کی۔ تقریر کے بعد کھانے پہ بیٹھے ہوئے تھے، میں نے ان سے پوچھا کہ حضرت آپ کا سن ولادت کیا ہے؟ فرمانے لگے ۱۹۷۵ء۔ میں نے کہا کہ حضرت جس شخصیت کی ملاقات کے بارے میں آپ تقریر میں فرما رہے تھے، وہ اس سے پندرہ یا سولہ سال پہلے دنیا سے رخصت ہو گئے تھے۔ یعنی کتاب کے اندر ایسے ہی لکھا تھا جس طرح وہ بیان فرما رہے تھے۔ یعنی رٹے کے اندر بھی اگر آدمی عقل سے کام لے تو کام چل سکتا ہے۔ میں یہ عرض کر رہا ہوں کہ ہمارے ہاں خطابت نقالی اور رٹے کا نام رہ گیا ہے۔ اگر اپنے دور کا ایک خطیب، اس کا انداز یہ ہے کہ وہ کرسی پر پاؤں رکھ کر تقریر کرتا ہے تو ہم اس کی بھی نقالی کریں گے۔ تقریر بھی اسی کی نقل کریں گے، انداز بھی اسی کا نقل کریں گے۔ یہ چیز ہم میں آ گئی ہے کہ ہم نے نقالی اور رٹا خطابت کے اندر گھسیڑ دیا ہے۔ اس وقت سے خطابت اپنی اہمیت کھو چکی ہے۔

اگر ہم اس چیز کو محسوس کریں کہ سوسائٹی کی ضرورت ہم نے پوری کرنی ہے اور سوسائٹی کے تقاضے کیا ہیں تو ہمیں سوسائٹی کے اندر رہنا ہوگا، سوسائٹی سے روابط رکھنے ہوں گے، سوسائٹی سے ان کی مشکلات اور ضروریات معلوم کرنی ہوں گی۔ ہمارے ہاں حالت کیا ہے کہ گلیوں میں یوم یکجہتی کشمیر منایا جا رہا ہوتا ہے اور میں مسجد میں بیٹھ کر بریلویوں کا دھڑلہ، اہل حدیثوں کا دھڑلہ نکال رہا ہوتا ہوں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ اس کی ضرورت نہیں، اپنے مقام پر اس کی بھی ضرورت ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ آج پوری کی پوری قوم کراچی سے لے کر خیبر تک جس عنوان پر اکٹھی ہو رہی ہے، مجھے اس کے لیے قوم کے اس تقاضے کو بھی پورا کرنا ہے۔ کشمیر کے بارے میں ہمارا موقف کیا ہے، کشمیر کے ساتھ ہماری ہمدردی کی بنیاد کیا ہے، ان کے ساتھ ہمارا ربط وتعلق کیا ہے۔ ہمیں پبلک کے سامنے اس چیز کا بھی اظہار کرنا ہے، لیکن نہیں۔ مجھے انتہائی افسوس کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ ہمارے ۹۰ فیصد سے زائد خطیب سوسائٹی کی ضرورت کا احساس نہیں کرتے اور جب تک ہم سوسائٹی کی ضرورت کا احساس نہیں کریں گے، تب تک ہم صحیح عنوان کا انتخاب نہیں کر سکتے۔

ہمارے ہاں خطبا کا ایک طبقہ تو وہ ہے جنہوں نے مہینوں کے حساب سے خطبات یاد کر لیے ہیں۔ یہ ربیع الاول کے ہیں، یہ ربیع الثانی کے ہیں، یہ ذوالقعدہ کے ہیں، یہ ذوالحجہ کے ہیں۔ اگلا سال شروع ہوتا ہے پھر وہی ترتیب شروع ہو جاتی ہے کہ پچھلے سال کی تقریر کس کو یاد ہے اور ایک طبقہ وہ ہے کہ جو سیاست کے اندر اس قدر گھس گئے ہیں کہ ان کے لیے ہفتے کی اخبارات کافی ہوتی ہیں۔ ہفتہ کی اخبارات سامنے رکھیں اور جمعہ پڑھا دیا۔ یہ دونوں طرز درست نہیں ہیں۔ ہمیں پبلک کی ضرورت محسوس کر کے موضوع کا انتخاب کرنا چاہیے۔ اس وقت سوسائٹی کے اندر حدود اللہ کا مسئلہ چل رہا ہے۔ ہم نے پبلک کو سمجھانا ہے کہ حدود اللہ کیا ہیں، ان کا حکم کیا ہے۔ اگر سوسائٹی کے اندر ناموس رسالت کا مسئلہ چل رہا ہے، تو ہمیں پبلک کو سمجھانا ہے کہ اس کی اہمیت کیا ہے۔ اگر سوسائٹی کے اندر عورتوں کا دن، والدین کا دن، بچوں کا دن، مزدوری کا دن چل رہا ہے تو ہمیں پبلک کو اسلام کے حوالے سے ان دنوں کی اہمیت کو بتانا ہے۔ لیکن اس طرف ہماری توجہ نہیں ہے۔ ہماری سوسائٹی کے اندر نفرتیں بڑھتی جا رہی ہیں، ہمیں اس بات کا احساس نہیں ہے کہ ہم سوسائٹی کی ان

نفرتوں کو کیسے دور کریں۔ ہمارا پورے کا پورا خاندانی نظام بگڑ رہا ہے۔ والدین اور اولاد کے درمیان، بھائی بھائی کے درمیان نفرت کی دیوار کھڑی ہو رہی ہے، لیکن کیا کبھی ہم نے محسوس کیا کہ ہم منبر پر بیٹھ کر بھی ان نفرتوں کو دور کرنے کے لیے کوئی کردار ادا کریں؟ جب تک ہم ان ضروریات کو محسوس نہیں کرتے اس وقت تک ہم اپنا فرض ادا نہیں کر سکیں گے۔

سیدنا ابوبکر صدیقؓ کا یوم وفات آتا ہے، ضرورت ہے کہ لوگوں کو بتانا چاہیے، لیکن کیا ابوبکر صدیقؓ کا مقام اتنا ہی ہے کہ انہوں نے سب سے پہلے اسلام قبول کیا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ معاونت کی، ان کے ساتھ ہجرت کی، تمام جہادوں میں شریک رہے؟ کیا یہ بتانا ہماری ذمہ داری نہیں کہ ابوبکر صدیقؓ نے خلافت کا نظام کیسے چلایا؟ حضرت عمر فاروقؓ کی شخصیت کو بھی ایک ہی دائرے میں بند کر دیا ہے کہ کیسے انہوں نے اسلام قبول کیا، کیسے ہجرت کی، کیسے مدینہ منورہ میں رہے، کیسے شہید ہو گئے۔ درمیان میں جو ان کا خلافت کا دور ہے، اپنی خلافت کو چلانے کے لیے ان کی سیاست کا نظام کیا تھا؟ عدالت کا نظام کیا تھا؟ انہوں نے روم و ایران کی پرانی تہذیبوں کے اندر سے کیسے ایک نئی تہذیب متعارف کرائی۔ کیا یہ سب بتانا ہماری ذمہ داری نہیں ہے؟ ہم جب شخصیات کے حوالے سے بھی دیکھتے ہیں تو ہمارے عنوانات شخصیت کے ایک مخصوص حصے تک محدود ہوتے ہیں۔ تو میں یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ جب تک ہم سوسائٹی کی ضرورت اور سوسائٹی کے مسائل کو نہیں سمجھتے، اس وقت تک ہمارے لیے موضوع کا تعین اور اس تعین کے ساتھ اپنے فرض کو ادا کرنا ہمارے لیے ممکن نہیں ہوگا۔

دوسری چیز ہے ''موضوع کی تیاری''۔ میں انتہائی افسوس کے ساتھ عرض کروں گا کہ ہمارے ہاں مارکیٹ میں بکنے والے خطبات نے ہمارے نوجوانوں کے مطالعے کا ذوق تباہ و برباد کر دیا ہے۔ اپنی پسند کے ایک خطیب کے خطبات لیے، اس کو دیکھا اور جمعہ پڑھا دیا۔ یہ سوچے بغیر کہ وہ خطیب کس ماحول میں بات کر رہا تھا۔ وہ تیس سال پہلے کے ماحول میں بات کر رہا تھا اور میں تیس سال بعد جب کہ ماحول بہت حد تک بدل چکا ہے۔ میں ماحول کی پروا کیے بغیر بیس، پچیس سال پہلے کے ماحول میں کی گئی تقریریں رٹ کر جمعہ پڑھا رہا ہوں۔ میرا ۱۹۸۵ء سے اپنا طرز یہ رہا ہے اور اب تک یہی معمول ہے کہ میں جمعرات کا دن باہر نہیں دیتا۔ ایک موضوع کا انتخاب کرتا ہوں۔ عشاء کی نماز سے لے کر فجر تک میں جمعہ کی تیاری کرتا ہوں۔ سب سے پہلے میں موضوع کے مطابق آیات تلاش کرتا ہوں، پھر ان آیات کے لیے میرے پاس جو دستیاب تفاسیر ہیں، انہیں دیکھتا ہوں۔ پھر اس کے مطابق احادیث دیکھتا ہوں، ان احادیث کی شروحات نکالتا ہوں، پھر میں اپنے مضمون کو ترتیب دیتا ہوں۔ ہمارے موضوع کا ایک پہلو دین کے حوالے سے ہے۔ اگر ہم نے اپنے اندر ذوق مطالعہ کو برقرار رکھا، جسے برقرار رکھنا چاہیے اور صرف مطبوعہ خطبات پر انحصار نہیں کیا تو پھر اس موضوع کے متعلق قرآن پاک کی آیات، ضروری نہیں کئی تفاسیر ہوں، اگر دو تفاسیر بھی ہیں، یا ایک بھی ہے جیسے معارف القرآن ہے، جیسے تفسیر عثمانی ہے، اگر ایک تفسیر سے بھی ان آیات کی تشریح پڑھ کر ان سے متعلق احادیث اور جو ان کی شروحات دستیاب ہیں، ان کو دیکھ کر اگر تیاری کی جائے تو میں پورے وثوق سے کہتا ہوں کہ اس سے ذوق مطالعہ بھی بڑھے گا اور ان شاء اللہ علم بھی بڑھے گا۔ اس کے علاوہ یہ کہ یہاں اگر کچھ سٹور ہوگا عقل اسی کے مطابق سپلائی کرے گی۔ یہاں اگر کچھ سٹور نہیں ہے تو عقل کے آگے جو کچھ انسان بولتا چلا جائے گا۔ ہمیں یہاں موضوع سے متعلق کچھ

سٹور کرنا ہے، پوری توجہ کے ساتھ اس کو ذہن میں بٹھانا ہے۔

حضرت شیخؒ فرماتے تھے۔ مجھے یاد ہے، ۱۹۷۷ء کی تحریک مصطفیٰ کے دوران شیخ نے میری تقریر سنی اور مجھے گھر بلا کر بڑے غصے سے کہا کہ کیا کر رہے تھے تم؟ یہ تقریر تھی؟ تقریر آستین چڑھانے کا نام نہیں، تقریر منہ سے تھوک نکالنے کا نام نہیں ہے۔ تقریر نام سے دو چیزوں کا۔ ایک یہ کہ جو تم کہہ رہے ہو، اس کے بارے میں تمہارا دل مطمئن ہے اور جو تم کہہ رہے ہو، وہ لوگوں کو سمجھ آ رہا ہے۔ اگر یہ دو چیزیں ہیں تو تقریر تقریر ہے۔ تو موضوع کی تیاری کے لیے ضروری ہے کہ جو موضوع منتخب کیا ہے، اس موضوع کے حوالے سے آیات قرآنیہ، ان کی تفاسیر، احادیث اور ان کی شروحات دیکھی جائیں۔ اگر ان کے اندر فقہی مسائل ہیں تو ان مسائل کو بھی دیکھ لیا جائے۔ اگر بزرگوں کے مسائل بھی اس موضوع کے مطابق مل جائیں تو نور علی نور ہے۔ اس کے اندر اور جان پیدا ہو جائے گی۔ اور اس کا ایک پہلو ہے جو سماجی بھی ہو سکتا ہے، سیاسی بھی ہو سکتا ہے، تاریخی بھی ہو سکتا ہے۔ موضوع کے اندر جو سیاسی، سماجی پہلو ہیں، ان کے لیے بھی ہمیں قابل اعتماد مواد حاصل کرنا ہے اور وہ قابل اعتماد ذریعہ تلاش کرنا ہے جس سے مجھے ٹھیک مواد مل جائے۔ میں اس مقام پر یہ ضرور کہوں گا کہ اس کے لیے علما کا میڈیا کے ساتھ وابستہ رہنا بہت ضروری ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ الیکٹرانک میڈیا کے ساتھ تعلق رکھو، لیکن اب ہمیں روزنامہ اسلام کے خول سے باہر نکلنا چاہیے اور اس خول سے باہر نکل کر آگے بڑھنا ہے۔ ہمیں صرف اسی پر انحصار نہیں کرنا کہ صبح روزنامہ اسلام پڑھ لیا، بس کافی ہے۔ نہیں بلکہ ہمیں میڈیا کے ساتھ وابستہ ہونا ہے اور میڈیا سے معلومات حاصل کر کے ہم نے اس موضوع پر جو دینی پہلو کے ساتھ دوسرا پہلو ہے، خواہ وہ سماجی ہے یا سیاسی ہے، اس کے لیے معلومات حاصل کرنی ہیں۔ اگر ہم ان چیزوں کا خیال رکھ سکیں تو میرا خیال ہے کہ ایک خطیب منبر پر بیٹھ کر اپنی منصبی ذمہ داری کو پوری طرح نبھا سکتا ہے۔ وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

(جاری)

اسلام اور انسانی حقوق

اقوام متحدہ کے عالمی منشور کے تناظر میں

محاضرات: مولانا زاہد الراشدی

ضبط و تحریر: ناصر الدین خان عامر

[صفحات: ۱۲۰۔ قیمت: ۶۵ روپے]

ناشر: الشریعہ اکادمی، گوجرانوالہ

''جہاد- کلاسیکی وعصری تناظر میں''

(ماہنامہ الشریعہ کی خصوصی اشاعت)

ماہنامہ الشریعہ گوجرانوالہ سے الشریعہ اکادمی کی طرف سے شائع ہونے والا ملک کا نامور ماہنامہ ہے جس کے رئیس التحریر جانشین امام اہل السنۃ شیخ الحدیث والتفسیر حضرت مولانا زاہد الراشدی اور مدیران کے صاحبزادے ممتاز اسلامی اسکالر مولانا حافظ محمد عمار خان ناصر ہیں۔ بحث ومباحثہ کے پلیٹ فارم پر اس رسالہ نے اہل علم اور عوام الناس میں غیر معمولی شہرت حاصل کی ہے۔ جہاں بہت سے اہل علم وقلم اس کی پالیسی کو سراہتے ہیں، وہاں کچھ شدت پسند لوگ اسے ہدف تنقید بھی بناتے ہیں۔ بہرحال یہ ہر ایک کے اپنے اپنے ذوق کی بات ہے۔

ماہنامہ الشریعہ اس سے قبل بھی کئی اہم خصوصی اشاعتیں مختلف موضوعات پر منظر عام پر لا چکا ہے۔ یہ بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ جہاد کے موضوع پر کئی اہل علم وقلم کے مضامین، مقالات اور مذاکرات اس کتاب کا حصہ ہیں۔ جہاد اسلام کا ایک اہم عمل ہے جو کبھی فرض عین اور کبھی فرض کفایہ ہوتا ہے۔ اس کے اصلی ڈھانچے پر ایمان رکھتے ہوئے غیر منصوص ضروریات اور طریقہ کار پر جب تک جہاد جاری رہے گا، اس کے لیے اجتہادی بحث ومباحثہ کی گنجائش بھی باقی رہے گی، لہٰذا یہ خاص اشاعت بھی بحث ومباحثہ کے حوالہ سے کوئی حرف آخر نہیں ہے، چنانچہ ابتدائیہ کے صفحہ ۱۲ پر مدیر صاحب نے بڑی صفائی کے ساتھ لکھ دیا ہے کہ ''ان موضوعات پر ''الشریعہ'' کے صفحات پر پہلے بھی بحث ومباحثہ ہوتا رہا ہے اور آئندہ بھی شاید کافی عرصے تک اس کو جاری رکھنے کی ضرورت محسوس کی جاتی رہے گی۔'' نیز ''یہ اشاعت خاص عصر حاضر کے ایک نہایت اہم اور حساس موضوع کے بہت سے علمی وعملی گوشوں کو واضح کرنے اور اس ضمن میں بحث ومباحثہ کے عمل کو آگے بڑھانے میں مددگار ثابت ہوگی۔'' بلفظہ۔

اس خصوصی اشاعت میں (۱) اسلام کا تصور جہاد- چند توضیحات، (۲) جہاد- ایک مطالعہ، (۳) معاصر مسلم ریاستوں کے خلاف خروج کا مسئلہ، (۴) دستور پاکستان سے متعلق القاعدہ کے مؤقف پر ابحاث بطور خاص مذکور ہیں۔ ۶۶۲ صفحات پر مشتمل اس اشاعت کی کمپوزنگ، کاغذ وطباعت اور رنگین کارڈ کور معیاری ہے۔ قیمت ۵۰۰ روپے، ناشر الشریعہ اکادمی، ہاشمی کالونی کنگنی والا گوجرانوالہ۔ علماء وطلباء اور عامۃ المسلمین سب ہی یکساں استفادہ کر سکتے ہیں۔

[تبصرہ: مولانا حاجی محمد فیاض خان سواتی، بشکریہ ماہنامہ ''نصرۃ العلوم'' گوجرانوالہ]

''جرح وتعدیل''

جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث وسنت کے بیسیوں پہلوؤں پر صدیوں سے علمی وتحقیقی کام ہو رہا ہے، مگر ہنوز تشنہ ہے اور اس علمی اور تحقیقی محنت کے دائرہ میں توسع وتنوع کی مسلسل پیش رفت جاری ہے۔

ائمہ محدثین نے حدیث کی سند اور رواۃ کو پرکھنے کے لیے جرح وتعدیل کے جو ضابطے بنائے ہیں اور جن کی بنیاد پر روایت حدیث کا عظیم الشان علمی ڈھانچہ استوار ہے، وہ بیسیوں محدثین کے لکھے ہوئے ہزاروں بلکہ اس سے بھی کہیں زیادہ اوراق میں بکھرے ہوئے ہیں اور نئی نسل کے لیے اس بات کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے کہ ان قواعد وضوابط اور اصول ترجیح کو ان کے دیگر متعلقات کے ساتھ آج کی آسان زبان میں عام فہم اسلوب کے ساتھ پیش کیا جائے تاکہ علوم حدیث کے قدیم ذخیروں تک آج کے نوجوان علماء اور نئی نسل کی رسائی آسان ہو جائے۔

فاضل محترم جناب ڈاکٹر اقبال محمد محمد اسحاق حفظہ اللہ تعالیٰ نے ''جرح وتعدیل'' کے عنوان سے اپنی اس ضخیم کتاب میں اسی ضرورت کو پورا کرنے کی کوشش کی ہے جو لائق داد ہے۔ انھوں نے جرح وتعدیل کے اصول وقواعد اور ان سے متعلق دیگر ضروری معلومات کو اچھے انداز میں مرتب کر دیا ہے جو علم حدیث سے تعلق رکھنے والے طلبہ اور اساتذہ دونوں کے لیے افادیت کا حامل ہے۔ اگرچہ بعض مقامات پر ان کے مسلکی ذوق کی ترجیحات جھلکتی دکھائی دیتی ہیں جو ایک فطری سی بات ہے، لیکن مجموعی طور پر ان کی یہ علمی کاوش وقت کی ایک اہم ضرورت کو پورا کرتی ہے۔

یہ ضخیم کتاب مکتبہ قاسم العلوم، اردو بازار لاہور کی طرف سے شائع کی گئی ہے۔ [تبصرہ: ابوعمار زاہد الراشدی]

''تحقیقات حدیث''

حدیث اور علوم حدیث پر مشتمل ایک علمی وتحقیقی سہ ماہی مجلّہ ''تحقیقات حدیث'' کا شمارہ ۳ (ستمبر ۲۰۱۱ء) اس وقت میرے سامنے ہے جو جامعہ خیر العلوم خیر پور ٹامیوالی کے شعبہ ''زاویہ علم وتحقیق'' کی طرف سے شائع ہو رہا ہے اور ہمارے فاضل دوست سید عزیز الرحمٰن صاحب اس کی ادارت کے فرائض سرانجام دے رہے ہیں۔ یہ مجلّہ ''نجیب الطرفین'' ہے کہ اس کی نسبت ایک طرف جامعہ خیر العلوم ٹامے والی سے ہے جو ہمارے مخدوم ومحترم بزرگ اور اپنے وقت کے جید عالم دین ومفتی حضرت مولانا مفتی غلام قادر صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کی یادگار اور صدقہ جاریہ ہے اور دوسری طرف یہ مجلّہ ایک عارف باللہ اور محقق بزرگ حضرت مولانا سید زوار حسین شاہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے خانوادہ سے منسوب ہے کہ ہمارے ممدوح سید عزیز الرحمٰن صاحب حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے پوتے ہیں۔

اس مجلّہ میں علم وتحقیق کا ذوق اور اس کے ساتھ فکر وشعور کا امتزاج رکھنے والیوں کے لیے بھی تسکین کا سامان وافر مقدار میں موجود ہے جو ایک مستقل دعوت فکر کی حیثیت رکھتا ہے۔ حدیث اور علوم حدیث کے حوالے سے ہمارے ہاں روایت اور روایتی اسلوب کے دائرہ میں تو بحمد اللہ تعالیٰ خاصا کام ہو رہا ہے، لیکن درایت کا یہ پہلو کہ عصری اسلوب میں حدیث نبوی کو پیش کیا جائے اور عصر حاضر کے تناظر میں حدیث نبوی کی تطبیق کی راہیں تلاش کی جائیں، ہمارے تعلیمی وتدریسی دائروں میں ابھی تک پوری توجہ حاصل نہیں کر پا رہا۔ ''تحقیقات حدیث'' دینی وعلمی حلقوں کو اس ضرورت کی طرف توجہ دلانے کی ایک اچھی کوشش ہے جس پر مسرت واطمینان کا اظہار کرتے ہوئے اس کی ترقی، تسلسل اور کامیابی کے لیے بارگاہ ایزدی میں دست بدعا ہوں۔ آمین

[تبصرہ: ابوعمار زاہد الراشدی]

حکیم محمد عمران مغل بی اے

نفسیاتی علاج کی اہمیت

حکیم ابوبکر رازیؒ کی حذاقت کا یہ واقعہ کتب میں مرقوم ہے کہ حاکم وقت کا لڑکا ذہنی اور نفسیاتی امراض میں جکڑا گیا۔ آخری علاج رازیؒ نے ہی کیا۔ بادشاہ کا لڑکا اپنی ضد پر قائم تھا کہ میں گائے ہوں، مجھے ذبح کیا جائے۔ رازی نے چند منٹ میں اس کی نفسیاتی کیفیت کو سمجھ کر علاج کیا اور شہزادہ ٹھیک ہو گیا۔ رازی نے کہا کہ میں ابھی آپ کو ذبح کرتا ہوں، لیکن یہ تو بتائیں کہ آپ کے جسم پر نہ گوشت پوست اور چربی ہے اور نہ ہی خون ہے۔ ہڈیوں پر چھری کیسے چلے گی؟ اس لیے آپ کچھ کھا پی لیں تا کہ گوشت پیدا ہو۔ اتنی سی بات پر شہزادے نے کھانا پینا شروع کر دیا اور اس کا ذہنی توازن ٹھیک ہو گیا۔

ہماری بود و باش اس سطح پر پہنچ چکی ہے اور اس میں اتنی تبدیلی آ چکی ہے کہ اگر کوئی معالج نفسیاتی طور پر نا کام ہے تو وہ جسمانی علاج قطعی طور پر نہیں کر سکتا۔ کچھ عرصہ قبل مجھے ایک متمول، دوبئ پلٹ مگر نہایت متقی و پرہیز گار خاتون کے علاج کے لیے بلایا گیا۔ سارا گھرانہ ڈاکٹروں پر مشتمل تھا۔ اس عورت کا بہنوئی لاہور کے بہت بڑے ہسپتال کا سربراہ تھا۔ پورا زور لگایا گیا، مگر مریضہ ٹھیک نہ ہو سکی۔ بیماری یہ تھی کہ مریضہ جو کچھ کھاتی، فوراً قے کے ذریعے خارج ہو جاتا۔ جون جولائی کا مہینہ تھا۔ میری تشخیص اور تدبیر بھی غلط نکلی۔ میں صبح سے شام تک سوچتا رہا۔ مریضہ کی بڑی بہن بڑی تجربہ کار، متقی پرہیز گار، نماز گانا کالوجسٹ تھی۔ میں نے اپنی تشخیص کا رخ موڑا۔ گھر والوں سے عرض کیا کہ مجھے آخری کوشش پوری کرنے دیں۔ مغرب کے قریب اللہ نے میری مدد کی اور میں قے بند کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ میں نے علم نفسیات کی مدد سے بات آگے بڑھائی تو یہ راز کھلا کہ محترمہ کی ایک نہایت لائق بیٹی نے سارے خاندان کو نظر انداز کرتے ہوئے قانونی طور پر مجسٹریٹ صاحب کے روبرو ایک نوجوان سے شادی رچالی ہے۔ میں نے محسوس کیا کہ اس خاتون کے سامنے اس کی لکھی پڑھی خوبرو لڑکی کے ساتھ ایک نوجوان گزرتا تو اس کی حالت غیر ہو جاتی۔ گرمی کا موسم تھا۔ میں نے گرم موسم کا خیال کرتے ہوئے پودینہ کے عرق کی پوری بوتل منگوائی اور ایک ایک پیالی پلاتا گیا، مگر قے نہ رکی۔ آخر بوتل ختم ہونے کو آئی تو قدرت نے میری کوشش کو قبول کر لیا۔ محترمہ کی نہ صرف قے رک گئی بلکہ ساتھ ہی وہ نیند کی آغوش میں چلی گئیں۔

بات یہ تھی کہ ماں نہیں چاہتی تھی کہ وہ نوجوان اس کا داماد بنے، جبکہ لڑکی اسی لڑکے سے شادی کی خواہش مند تھی۔ اسی کشمکش میں وقت گزرتا گیا اور ماں کی حالت غیر ہوتی گئی۔ جونہی وہ اپنے داماد کو دیکھتی، اس کے اندرونی نظام نفسیاتی طور پر شدید متاثر ہوتا اور کھایا پیا باہر آ جاتا۔ پودینے کے عرق نے سارے جسم کو ٹھنڈا کر دیا اور قے رک گئی۔ میں نے تھوڑی سی کوشش کر کے اپنی تشخیص کا رخ موڑا تو مسئلہ حل ہو گیا۔ پرانے اطبا نے نفسیات کے علم کے بول بوتے پر پیچیدہ امراض کا علاج کر کے سیکڑوں مریضوں کی جان بچائی ہے۔